سوال تمہارے جواب ہمارے

اہل سنت اور شیعہ حضرات کے مابین دس اہم مورد بحث
مسائل پر تحقیق

تالیف

آیت اللہ العظمیٰ آقای مکارم شیرازی دام ظلہ العالی

قم المقدسہ ایران

بسم الله الرحمن الرحیم

سوال تمہارے
جواب ہمارے

اہل سنت اور شیعہ حضرات کے مابین دس اہم مورد بحث
مسائل پر تحقیق

مؤلف

آیت اللہ العظمیٰ آقای مکارم شیرازی مدظلہ العالی

قم المقدسہ ایران

معارف اسلام پبلشرز قم ایران

نام کتاب	......	سوال تمہارے جواب ہمارے
مؤلف	......	آیت اللہ العظمیٰ مکارم شیرازی
مترجم	......	معارف اسلام پبلشرز
ناشر	......	انتشارات نور مطاف
اشاعت	......	پہلی
تاریخ اشاعت	......	ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ۔ق
تعداد	......	۵۰۰۰
ہدیہ	......	۱۴۵روپے

معارف اسلام پبلشرز قم ایران

فہرست مطالب

فہرست مطالب

پہلی فصل:
قرآن مجید ہر قسم کی تحریف سے منزہ ہے

دوسری فصل:
'تقیہ' قرآن وسنت کے آئینہ میں

تیسری فصل:

عدالت صحابہ

چوتھی فصل:

بزرگوں کی قبروں کا احترام

پانچویں فصل:
نکاح موقت (متعہ)

چھٹی فصل:
زمین پر سجدہ

ساتویں فصل:
جمع بین صلاتین

آٹھویں فصل:
وضو میں پاؤں کا مسح

نویں فصل:
بسم اللہ، سورۃ الحمد کا جزء ہے

دسویں فصل:
اولیائے الٰہی سے توسل

مقدمہ:

حمد ہے اس ذات کے لیے جس نے انسان کو قلم کے ساتھ لکھنا سکھایا اور درود و سلام ہو اس نبی پر جسے اس نے عالمین کے لیے سراپا رحمت بنا کر مبعوث فرمایا اور سلام و رحمت ہو ان کی آل پر جنہیں اس نے پورے جہاں کے لیے چراغ ہدایت بنایا۔

اما بعد: آپ کے ہاتھوں میں موجود کتاب کے عظیم مصنف نے اس میں اسلام کے مختلف مکاتب فکر کے درمیان پائے جانے والے دس اختلافی مسائل پر انتہائی مختصر، عام فہم اور منصفانہ بحث کی ہے۔

مصنف کی روش یہ ہے کہ ایک مسئلہ کو پیش کر کے اس پر طرفین کی ادلہ ذکر کرتے ہیں اور آخر میں نتیجہ قارئین محترم پر چھوڑ دیتے ہیں تا کہ قارئین کرام خود فیصلہ کر سکیں کہ حق کس کے ساتھ ہے۔

اللہ تعالی نے اس عظیم کتاب کے ترجمہ کی سعادت و توفیق بھی معارف اسلام پبلشرز کو عنایت فرمائی ہے اور اس خوبصورت ترجمہ کی زحمت فاضل برادر جناب آقای سید محسن علی کاظمی نے اٹھائی ہے۔ خدا انکی توفیقات میں اضافہ فرمائے ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے درمیان وحدت کا باعث بنے گی۔

معارف اسلام پبلشرز

مقدمہ

یہ راستہ وحدت کی طرف نہیں جاتا!

اس دنیا کے موجودہ حالات پر ایک اجمالی نگاہ دوڑانے سے پتہ چلتا ہے کہ شدید طوفان چل رہے ہیں، پردے ہٹ چکے ہیں، دلفریب باتوں، انسانی حقوق کے دعوے، ڈیموکریسی اور اقوام متحدہ جیسے بین الاقوامی اداروں کے نعروں کی حیثیت واضح ہو چکی ہے۔ عالمی طاقتوں نے دوسرے ملکوں پر قبضہ کرنے کے لئے خطرناک سازشیں آمادہ کر رکھی ہیں اور وہ کھلے لفظوں میں اپنے دل کی باتوں کو بیان کر رہے ہیں۔

اور کتنا اچھا ہوا کہ انہوں نے ان تمام باتوں کا اظہار کر دیا ہے اور اپنے اوپر بے جا اعتماد کرنے والوں کی آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا ہے۔ اور اب اللہ تعالی کے لطف و عنایت کے بعد قوموں کی اپنی قدرت و طاقت کے علاوہ کوئی پناہ گاہ باقی نہیں رہی ہے۔ ہاں اپنے آپ کو طاقتور بنانا چاہیے کیونکہ دنیا کے اس نظام میں کمزور کو پایمال کیا جاتا ہے۔

ان شرائط میں اگر پوری دنیا کے مسلمان متحد ہو جائیں اور اپنی عظیم ثقافتی اور مادی طاقت کو استعمال کریں تو اسی صورت میں طاغوتی طاقتوں کے شر سے امان میں رہ سکتے ہیں۔ کئی سالوں سے ہر جگہ وحدت مسلمین کی باتیں زبانوں پر جاری ہیں۔ ہفتہ وحدت کی تشکیل، وحدت کے

سلسلہ میں کانفرنسوں اور سیمناروں کے انعقاد کی خبروں کا چرچا ہے۔

اگرچہ ان اقدامات کے سیاسی اور اجتماعی میدانوں میں اچھے آثار سامنے آئے ہیں اور دشمن خوفزدہ ہو گئے ہیں۔ لیکن ابھی تک ان اقدامات سے ایسی وحدت وجود میں نہیں آئی جس کا لازمہ ان عظیم طوفانوں کے مقابلے میں ڈٹ جانا اور مقاومت کرنا ہو۔

اس بات کے اسباب کو چند امور میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے:

۱۔اس سلسلہ میں کئے جانے والے اقدامات بنیادی نہیں تھے جس کی وجہ سے مسئلہ وحدت اسلامی، معاشروں کے عمق اور مسلمانوں کے افکار میں نفوذ نہیں کر سکا ہے تا کہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو ایک ہی راستے پر اکٹھا کرتا۔

۲۔دشمنوں نے بدگمانی، سوءظن، اختلاف اور نفاق ایجاد کرنے کیلئے وسیع پیمانے پر کام کیا ہے۔ اور جسطرح خبروں سے اندازہ ہوتا ہے انہوں نے ان مسائل کو عملی بنانے کے لیے مادی اعتبار سے بھی بہت بھاری سرمایہ مختص کیا ہوا ہے اور اپنے شوم مقاصد کو پورا کرنے کے لئے دونوں طرف سے متعصب اور شدت پسند افراد کو استعمال کرتے ہیں۔ من جملہ:

الف) ہمیں باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حال ہی میں سعودی عرب کے متعصب سلفیوں نے ایک کروڑ تفرقہ انگیز کتابیں چھپوا کر حجاج کے درمیان تقسیم کی ہیں اور حج جو مسلمانوں کی وحدت کا ذریعہ تھا، کو نفاق کے وسیلہ میں تبدیل کر دیا ہے اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس قسم کے کام ہر سال کیے جاتے ہیں۔

ب) حج اور عمرہ کے ایام میں متعصب وہابی خطیب نفاق پیدا کرنے کے لیے زہر اگلنے کا کام کرتے ہیں اور ایران و سعودی عرب کے اچھے تعلقات کے باوجود انہوں نے شیعوں کے

خلاف حملے اور زیادہ کر دیے ہیں۔

ج) سپاہ صحابہ کے حملے اور مظلوم و بے گناہ افراد کا وحشیانہ قتل، اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک اس قتل و غارت اور دہشت گردی پر فخر کرنا ہے جسے آئے دن تھوڑے وقفے انجام دیا جاتا ہے۔ یہ بات سب لوگوں پر عیاں ہے۔

د) طالبان جیسے انتہا پسند گروہوں کو اکسانا، شواہد کے مطابق یہ کام بھی امریکی ایجنسیوں کی طرف سے انجام پانے والا ایک خطرناک کام تھا تا کہ ایک طرف تو اسلام کے چہرے کو بدنما، بے رحم اور علم و دانش اور تہذیب و تمدن سے بے بہرہ ظاہر کریں اور دوسری طرف مسلمانوں کے درمیان تفریق کو زیادہ کریں۔ اگرچہ یہ مغربی سیاست کے سائے میں پلنے والا گروہ آخر کار انکے کنٹرول سے خارج ہو گیا تھا اور خود ان ہی کے خلاف برسرپیکار ہو گیا تھا۔ اسطرح جب امریکہ کو اپنے نمک خواروں کے تلخ نتائج کا سامنا کرنا پڑا تو وہ انکے ختم کرنے کے درپے ہوا۔

۳۔بعض اسلامی سیاستدانوں کی کوتاہ فکری بھی پائیدار وحدت کے اہداف کے حصول میں مانع ثابت ہوئی کیونکہ انہوں نے اپنے محدود اور وقتی منافع کو، عالم اسلام کے طولانی منافع پر مقدم کیا۔ مثال کے طور پر ہم بعض اسلامی ممالک کو جانتے ہیں کہ جنہوں نے اپنے محدود اور کم اہمیت منافع کی خاطر اسرائیل کے ساتھ بہت زیادہ سیاسی اور اقتصادی تعاون کیا، یہاں تک کہ اس کے ساتھ مشترکہ جنگی مشقیں کیں اور یہ بات آج سب پر آشکار ہو چکی ہے۔

بہرحال جو چیز علمائے اسلام کے اختیار میں ہے وہ یہ کہ ضمناً ان غلطیوں کے برے نتائج کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اور اس جانب متوجہ کرتے ہوئے کہ کوئی ایک اسلامی گر...

قرآن ہر قسم کی تحریف سے منزہ ہے

اسلام دشمن طاغوتی طاقتوں کی ظالمانہ اور بے رحم سیاست سے امان میں نہیں رہے گا، یہ کریں کہ جہاں تک ممکن ہو مذہبی مسائل کو شفاف بنائیں تا کہ دشمنوں کو زہر اگلنے اور انتہا پسند و متعصب گروہوں کو سوءظن پیدا کرنے کا موقع نہ مل سکے۔

اس نکتہ کے پیش نظر ہم نے اس کتاب میں کہ جو قارئین محترم کے ہاتھ میں ہے، مسلمانوں کی صفوں کو تقویت پہنچانے کے لئے ایک جدید اور دلکش روش سے استفادہ کیا ہے۔ اس روش میں یہ مسئلہ مکمل طور پر روشن ہو جائیگا کہ مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں اور اہلسنت کے درمیان اہم اختلافی مسائل کی بنیاد خود انگی اپنی مشہور کتابیں ہیں اور ان مسائل میں شیعہ حضرات کے نظریات کی واضح اور روشن دلیلیں اہل سنت کی اپنی کتابوں میں موجود ہیں۔ اہلسنت کے ایک آزاد؟ عالم دین کے بقول "شیعہ اپنے مذہب کے تمام اصول اور فروع کو ہماری کتب سے ثابت کر سکتے ہیں"۔

اگر یہ بات ثابت ہو جائے، کہ انشاء اللہ اس کتاب میں ثابت ہو جائیگی، تو پھر مکتب اہلبیتؑ کے پیروکاروں کے عقائد کی نسبت کسی طرح کے تردد، مذمت یا شبہہ ایجاد کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ بلکہ یہ بات یقیناً منطقی اور منصف مزاج افراد سے سوءظن کو برطرف کرنے اور مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے نیز حسن ظن رکھنے کا باعث بنے گی اور ایران جو ایک قدرتمند اسلامی ملک ہے اسی طرح اسلام کے مدافع کے اعتبار سے باقی رہے گا، اور اسی طرح تمام شیعیان جہان بھی۔ اب حضور والا! یہ آپ اور یہ ہماری دلیلیں!

عدم تحریف قرآن:

شیعوں کے خلاف ہونے والے جھوٹے پروپیگنڈے کے برعکس ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ آج جو قرآن مجید ہمارے اور تمام مسلمانوں کے پاس ہے یہ بالکل وہی قرآن مجید ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اور اس میں حتیٰ ایک لفظ کی بھی کمی و زیادتی نہیں ہوئی ہے۔ ہم نے اس مسئلہ کو اپنی تفسیر، اصول فقہ وغیرہ کی متعدد کتب میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور عقلی و نقلی ادلہ کے ذریعہ اسے ثابت کیا ہے۔

ہم قائل ہیں کہ تمام مسلمان علماء اعم از شیعہ و سنی کا اس بات پر اجماع ہے کہ قرآن مجید میں کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوا ہے اور دونوں مذہب کے محققین کی اکثریت جو اتفاق کے قریب ہے اس بات کی قائل ہے کہ اس میں کسی قسم کی کمی بھی واقع نہیں ہوئی ہے۔

دونوں طرف کے چند گنے چنے افراد اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن مجید میں کمی واقع ہوئی ہے جبکہ مشہور علماء اسلام ان کی اس بات کے طرفدار نہیں ہیں۔

فریقین کی دو کتابیں:

ان گنتی کے چند علماء میں سے ایک اہل سنت عالم دین "ابن الخطیب مصری" ہیں جنہوں نے "الفرقان فی تحریف القرآن" نامی کتاب لکھی جو ۱۹۴۸ عیسوی بمطابق

(۱۳۶۷ ہجری قمری) میں نشر ہوئی ۔ لیکن بروقت الازہر یونیورسٹی کے علماء اس کتاب کی طرف متوجہ ہو گئے اور انہوں نے، اس کتاب کے نسخوں کو جمع کر کے ضائع کر دیا لیکن اس کے چند نسخے غیر قانونی طور پر آس پاس کے لوگوں تک پہنچ گئے۔

اسی طرح ایک کتاب (فصل الخطاب فی تحریف کتاب ربّ الأرباب) کے نام سے شیعہ محدث حاجی نوری کے توسط سے لکھی گئی جو ۱۲۹۱ ہجری قمری میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی حوزہ علمیہ نجف اشرف کے بزرگ علماء نے اس کتاب کے مطالب سے اظہار برائت کیا اور اس کتاب کی جمع آوری کا حکم دیدیا۔ اور اس کے بعد کئی کتابیں اس کے رد میں لکھی گئیں۔ جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔

۱۔ نامور فقیہ مرحوم محمود بن ابی القاسم المعروف بہ معرب طہرانی (متوفی سال ۱۳۱۳ھ۔ق) نے (کشف الارتیاب فی عدم تحریف الکتاب) نامی کتاب لکھی جو کتاب فصل الخطاب کا ردّ تھا۔

۲۔ مرحوم علامہ سید محمد حسین شہرستانی (متوفی ۱۳۱۵ھ۔ق) نے بھی ایک کتاب بنام (حفظ الکتاب الشریف عن شبهة القول بالتحریف) حاجی نوری کی کتاب فصل الخطاب کے جواب میں لکھی۔

۳۔ مرحوم علامہ بلاغی (متوفی ۱۳۵۲ھ۔ق) حوزہ علمیہ نجف کے عظیم محقق نے بھی اپنی مشہور کتاب (تفسیر آلاء الرحمٰن) میں ایک قابل ملاحظہ باب، فصل الخطاب کے رد میں لکھا ہے (۱)

---

۱) آلاء الرحمٰن، جلد ۱ ص ۲۵۔

۴۔ ہم نے بھی اپنی کتاب (انوار الاصول) میں عدم تحریف قرآن مجید کے بارے میں انتہائی مفصل بحث کی ہے اور فصل الخطاب کے شبہات کا دندان شکن جواب دیا ہے۔

مرحوم حاجی نوری اگرچہ عالم دین تھے لیکن بقول علامہ بلاغی انہوں نے ضعیف روایات پر اعتماد کیا ہے اور مذکورہ کتاب شائع ہونے کے بعد خود بھی نادم و پشیمان ہوئے۔ اور حوزہ علمیہ نجف اشرف کے تمام بزرگ علماء نے اس اقدام کو واضح طور پر ایک غلطی قرار دیا ہے۔ (۱)

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ کتاب فصل الخطاب کے شائع ہونے کے بعد ہر طرف سے حاجی نوری کی مخالفت کا ایسا عظیم طوفان اٹھا کہ وہ خود اپنے دفاع میں ایک رسالہ لکھنے پر مجبور ہو گئے جس میں انہوں نے لکھا کہ میری مراد عدم تحریف قرآن مجید تھی لوگوں نے میری تعبیرات سے سوء استفادہ کیا ہے۔ (۲)

مرحوم علامہ سید ھبۃ الدین شہرستانی کہتے ہیں کہ میں اس وقت سامرا میں تھا اور میرزا شیرازی بزرگ نے اس وقت سامرا کو علم و دانش کا مرکز بنا دیا تھا۔ جس محفل میں بھی ہم جاتے ہر طرف سے حاجی نوری اور اُن کی کتاب کے خلاف صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ اور بعض لوگ تو انتہائی نازیبا الفاظ کے ساتھ انکو یاد کرتے تھے (۳)

کیا اتنی مخالفت کے باوجود بھی حاجی نوری کی باتوں کو شیعہ عقیدہ شمار کرنا چاہیے؟ بعض

---

۱) آلاء الرحمٰن، جلد ۱، ص ۳۱۱۔

۲) الذریعہ، جلد ۱۶، ص ۲۳۱۔

۳) برہان روشن، ص ۱۳۳۔

متعصب وہابی اس کتاب (فصل الخطاب) کو بہانہ بنا کر تحریف قرآن کے نظریہ کو شیعوں کی طرف نسبت دیتے ہیں حالانکہ:

۱۔ ایک کتاب کی تالیف اس مسئلہ میں شیعہ عقیدہ پر دلیل بن سکتی ہے تو پھر اس تحریف قرآن والے نظریہ کو علمائے اہل سنت کی طرف بھی نسبت دینی چاہیے کیونکہ ابن الخطیب مصری نے بھی تو (الفرقان فی تفسیر القرآن) نامی کتاب لکھی تھی اور اگر جامعۃ الازہر کے علماء کی تردید اس کتاب کے مطالب کی نفی پر دلیل بن سکتی ہے تو علمائے نجف اشرف کا اظہار برائت بھی فصل الخطاب کے مفاہیم کی نفی پر دلیل بن سکتا ہے۔

۲۔ اہل سنت کی دو مشہور تفاسیر، تفسیر قرطبی، اور تفسیر درالمنثور میں حضرت عائشہ (زوجہ رسولؐ) سے نقل کیا گیا ہے کہ:

(و انها ـ ای سورة الاحزاب (١١) كانت مائتی آية فلم يبق منها الا ثلاث و سبعين) (۱)

سورۃ الاحزاب کی ۲۰۰ آیات تھیں اور اب ۷۳ سے زیادہ باقی نہیں بچی ہیں!

اس سے بڑھ کر صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بھی ایسی روایات نظر آتی ہیں جن سے تحریف کی بو آتی ہے (۲)

لیکن ہم ہرگز کسی ایک مصنف یا چند ضعیف روایات کی وجہ سے تحریف والے قول کو اہل سنت کی طرف نسبت نہیں دیتے ہیں۔

اسی طرح انہیں بھی کسی ایک مصنف یا چند ضعیف روایات کی وجہ سے کہ جن کا جمہور علمائے

---

۱) تفسیر قرطبی، جلد ۱۴، ص ۱۱۳ و تفسیر الدر المنثور، جلد ۵، ص ۱۸۰۔

۲) صحیح بخاری، جلد ۸، ص ۲۰۸ تا ۲۱۱ و صحیح مسلم، جلد ۴، ص ۱۶۷ و جلد ۵، ص ۱۱۶۔

شیعہ نے انکار کیا ہے، اس قول تحریف کو شیعوں کی طرف نسبت نہیں دینی چاہیے۔

۳۔ حاجی نوری کی کتاب فصل الخطاب میں عام طور پر ان تین راویوں سے احادیث لی گئی ہیں کہ جو یا تو فاسد المذہب، یا کذاب اور جھوٹے یا مجہول الحال ہیں۔ (احمد ابن محمد السیاری، فاسد المذہب، علی ابن احمد کوفی، کذاب، اور ابی الجارود مجہول یا مردود) (۱)

فرقہ وارانہ دشمنی کی خاطر اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا نہ کیا جائے۔

۴۔ جن لوگوں کا اصرار ہے کہ مذہب شیعہ کو تحریف قرآن کے عقیدہ سے متہم کیا جائے، گویا وہ اس بات کی طرف متوجہ نہیں ہیں کہ فرقہ وارانہ خصومت کی خاطر وہ اسلام کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ کیونکہ غیر مسلم لوگ کہیں گے کہ عدم تحریف کا عقیدہ مسلمانوں کے درمیان مسلم اور متفقہ عقیدہ نہیں ہے۔

کیونکہ ایک عظیم گروہ تحریف قرآن کا قائل ہے۔ ہم ان بھائیوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ فرقہ واریت اور تعصب آمیز دشمنی کی خاطر قلب اسلام یعنی قرآن مجید کو نشانہ نہ بنائیں۔ آیئے اسلام اور قرآن پر رحم کیجیے اور بے جا تحریف کی باتوں کو اچھال کر دشمن کو موقع فراہم نہ کیجیے۔

۵۔ شیعوں کے خلاف یہ تہمت اور افترا اس قدر پھیل چکی ہے کہ ایک مرتبہ ہم عمرہ کی خاطر بیت اللہ مشرف ہوئے۔ سعودی عرب کے وزیر مذہبی امور سے ہماری ملاقات ہوئی اس نے ہمارا پرتپاک استقبال کیا۔ لیکن کہنے لگا تمہارا قرآن ہمارے قرآن سے مختلف ہے (سمعت ان لكم مصحفا غير مصحفنا)!!

---

۱) ان تین راویوں کے مزید حالات کے لیے رجال نجاشی، فہرست شیخ، اور [illegible]

میں نے جواب میں کہا، اس بات کو آزمانا انتہائی آسان ہے۔ آپ خود ہمارے ساتھ تشریف لے چلیے یا اپنا نمائندہ بھیج دیں (تمام اخراجات ہمارے ذمہ ہونگے) واپس تہران چلے چلتے ہیں۔ قرآن مجید تمام مساجد اور گھروں میں موجود ہیں۔ تہران میں ہزاروں مسجدیں اور لاکھوں گھر ہیں۔ مسجد یا گھر کا انتخاب آپکے نمائندے کے اختیار میں ہوگا۔ وہ جس گھر کا انتخاب کرے گا ہم اس دروازے پر دستک دیکر قرآن مجید طلب کریں گے اس وقت آپ دیکھ لینا کہ شیعوں کے گھروں میں موجود قرآن مجید، دیگر مسلمان ممالک کے قرآن مجید کے ساتھ ایک لفظ کا بھی فرق نہیں رکھتا ہے۔ آپ جیسے اعلی تعلیم یافتہ لوگوں کو اس قسم کی جھوٹی افواہوں کا شکار نہیں ہونا چاہیے!

۶۔ ہمارے بہت سے قاری، انٹرنیشنل مقابلہ قرآت میں اول نمبر پر آئے ہیں۔ ہمارے حافظ، بالخصوص ہمارے کمسن حفاظ نے بہت سے اسلامی ممالک میں تعجب خیز اور قابل تحسین قرآنی منظر پیش کیئے ہیں۔ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ہمارے حفاظ اور قاریوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہمارے وسیع وعریض ملک میں جگہ جگہ حفظ، قرآت، تفسیر قرآن کی کلاسیں اور علوم قرآن کے کالج و یونیورسٹیاں موجود ہیں۔ ان تمام چیزوں کا اثبات، نزدیک سے مشاہدہ کے ذریعہ تمام لوگوں کے لئے آسان ہے۔

ان تمام موارد میں صرف اسی قرآن مجید سے استفادہ کیا جاتا ہے جو تمام مسلمان ممالک میں متداول ہے اور ہمارا کوئی بھی باشندہ اس معروف قرآن کے علاوہ کسی دوسرے قرآن کو نہیں پہچانتا ہے۔ اور ہمارے ہاں کسی بھی مجلس یا محفل میں تحریف قرآن کی بات نہیں کی جاتی ہے۔

عدم تحریف پر عقلی اور نقلی دلیلیں:

۷۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق بہت سے عقلی اور نقلی دلائل موجود ہیں جو قرآن مجید کی عدم تحریف پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ ایک تو خود قرآن مجید فرماتا ہے: (انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون) (ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا اور اس کی حفاظت بھی ہمارے ذمہ ہے(۱)) ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے:

(و انہ لکتاب عزیز۔ لایاتیہ الباطل من بین یدیہ و لا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید۔(۲)

"یہ کتاب شکست ناپذیر ہے۔ اس میں باطل اصلا سرایت نہیں کر سکتا ہے نہ سامنے سے اور نہ پیچھے کی طرف سے کیونکہ یہ حکیم وحمید خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے"

کیا اس قسم کی کتاب جسکی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالی نے لی ہو اس میں کوئی تحریف کرسکتا ہے؟!

اور ویسے بھی قرآن مجید کوئی متروک اور بھلائی گئی کتاب نہیں تھی کہ کوئی اس میں کمی یا زیادتی کر سکے۔

کاتبان وحی کی تعداد چودہ سے لیکر تقریبا چار سو (۴۰۰) تک نقل کی گئی ہے۔ جیسے ہی کوئی آیت نازل ہوتی یہ افراد فورا اسے لکھ لیتے تھے۔ علاوہ براین سینکڑوں حافظ قرآن پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں تھے جو آیت کے نازل ہوتے ہی اس کو حفظ کر لیتے تھے اور قرآن مجید کی

۱) سورۃ حجر آیت ۹۔
۲) سورۃ فصلت آیت ۴۱ و ۴۲۔

تلاوت کرنا اس زمانے میں انکی سب سے اہم عبادت شمار ہوتی تھی۔ اور دن رات قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی تھی۔

اس سے بڑھ کر قرآن مجید، اسلام کا بنیادی قانون اور مسلمانوں کی زندگی کا آئین و اصول تھا اور زندگی کے ہر شعبے میں قرآن مجید حاضر و موجود تھا۔

عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ ایسی کتاب میں تحریف اور کسی کمی اور زیادتی کا امکان نہیں ہے۔

آئمہ معصومینؑ سے جو روایات ہم تک پہنچی ہیں وہ بھی قرآن مجید کی عدم تحریف اور تمامیت پر تاکید کرتی ہیں۔

امیر المومنین علیؑ، نہج البلاغہ میں واضح الفاظ میں فرماتے ہیں؛

(انزل علیکم الکتاب تبیانا لکل شی و عمر فیکم نبیّه ازمانا حتی اکمل له و لکم فیما انزل من کتاب، دینه الذی رضی لنفسه)(۱)

(اللہ تعالی نے ایسا قرآن مجید نازل کیا جو ہر شے کو بیان کرتا ہے پھر اس نے اپنے پیغمبرؐ کو اتنی عمر عطا فرمائی کہ وہ اپنے دین کو تمہارے لیے قرآن مجید کے وسیلہ سے کامل کردیں۔

نہج البلاغہ کے خطبوں میں بہت سے مقامات پر قرآن مجید کا تذکرہ ہوا ہے لیکن کہیں بھی قرآن مجید کی تحریف سے متعلق ذرہ برابر اشارہ نہیں ملتا بلکہ قرآن مجید کے کامل ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔

۱) نہج البلاغہ خطبہ ۸۶۔

نویں امام حضرت امام محمد تقیؑ اپنے ایک صحابی کو لوگوں کے حق سے منحرف ہو جانے کے بارے میں فرماتے ہیں۔

(و کان من نبذهم الکتاب ان أقامو حروفه و حرفو حدودهٗ)(۱)

بعض لوگوں نے قرآن مجید کو چھوڑ دیا ہے، وہ اس طرح کہ اس کے الفاظ کو انہوں نے حفظ کرلیا ہے اور اس کے مفاہیم میں تحریف کی ہے۔

یہ اور اسکی مانند دیگر احادیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ اس کے معانی میں تحریف ہوئی ہے۔ بعض لوگ اپنی خواہشات اور ذاتی منافع کی خاطر آیات کی خلاف واقع تفسیر و توجیہ کرتے ہیں۔ یہاں سے ایک اہم نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ اگر بعض روایات میں تحریف کی بات ہوئی بھی ہے تو اس سے تحریف معنوی اور تفسیر بالرائی مراد ہے نہ الفاظ و عبارات کی تحریف۔

دوسری طرف سے بہت سی معتبر روایات جو آئمہ معصومینؑ سے ہم تک پہنچی ہیں میں بیان کیا گیا ہے کہ روایات کے صحیح و ناصحیح ہونے کی تشخیص کے لئے بالخصوص جب انکے درمیان ظاہراً تضاد و اختلاف پایا جارہا ہو تو معیار، قرآن مجید کے ساتھ تطبیق دینا ہے۔ جو حدیث قرآن مجید کے مطابق ہو وہ صحیح ہے اس پر عمل کیا جائے اور جو حدیث قرآن مجید کے خلاف ہو اسے چھوڑ دیا جائے۔

۱) کافی جلد ۸ ص ۵۳۔

(اعرضوا هما علی کتاب الله فما وافق کتاب الله فخذوه و ما خالف کتاب الله فردوه)(۱)

یہ بالکل واضح دلیل ہے کہ قرآن مجید میں تحریف نہیں ہوئی ہے۔ کیونکہ اگر تحریف ہوجاتی تو قرآن مجید حق وباطل کی تشخیص کا معیار قرار نہیں پاسکتا تھا۔

ان تمام ادلہ سے بڑھ کر مشہور حدیث ''حدیث ثقلین'' شیعہ واہل سنت کتابوں میں کثرت کے ساتھ نقل ہوئی ہے(۱) جس میں پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

(انی تارک فیکم الثقلین کتاب الله و عترتی اهل بیتی ما ان تمسکتم بهما لن تضلو)

میں تمہارے درمیان دو یادگار گرانبہا چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت ہے اگر ان دونوں سے تمسک رکھا تو ہرگز گمراہ نہیں ہوگے۔

یہ پر مغز حدیث شریف بالکل واضح کررہی ہے کہ قرآن مجید، عترت پیغمبرؐ کے ساتھ قیامت تک لوگوں کی ہدایت کے لیے ایک انتہائی مطمئن پناہ گاہ ہے۔ اب اگر قرآن مجید خود تحریف کا شکار ہوجاتا تو وہ کس طرح لوگوں کے لئے ایک مطمئن پناہ گاہ بن سکتا تھا اور انہیں ہر قسم کی گمراہی سے نجات دلاسکتا تھا۔

اختتامیہ کلمات: آخری بات یہ ہے کہ اللہ تعالی کے نزدیک یہ گناہ کبیرہ ہے کہ کسی پر ایسی بات یا ایسے کام کی تہمت لگائی جائے جو اس نے نہ کہی ہو یا اُسے انجام نہ دیا ہو۔

---

۱) وسائل الشیعہ، جلد ۱۸ص ۸۰۔

ہم نے ہر مقام پر کہا ہے اور اب بھی کہتے ہیں کہ مذہب شیعہ کے علماء ومحققین میں سے کوئی بھی (خود انکی اپنی کتابوں کی گواہی کے مطابق) تحریف کا قائل نہیں تھا اور نہ ہے۔ لیکن پھر بھی بعض تعصب اور ہٹ دھرم قسم کے لوگ اس تہمت پر اصرار کرتے ہیں۔ پتہ نہیں قیامت والے دن وہ کیا جواب دیں گے کیونکہ ایک طرف تو تہمت لگا رہے ہیں اور دوسری طرف قرآن مجید کی اہمیت کو کم کررہے ہیں۔

اگر آپ کا بہانہ وہ بعض ضعیف روایات ہیں جو ہماری کتابوں میں نقل ہوئی ہیں تو اس قسم کی ضعیف روایات آپ کی حدیث وتفسیر کی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ جنکی طرف پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے۔

کوئی بھی مذہب ضعیف روایات کی بنا پر استوار نہیں ہوتا ہے۔

اور ہم نے کبھی بھی ابن الخطیب مصری کی کتاب (الفرقان فی تحریف القرآن) کی خاطر یا آپ کی ان ضعیف روایات کی خاطر جو تحریف قرآن پر مشتمل ہیں آپ پر تحریف قرآن کی تہمت نہیں لگائی۔ اور ہم کبھی بھی قرآن مجید کو تخریب کاری کرنے والے تعصب کا شکار نہیں ہونے دیں گے۔

دن رات تحریف قرآن کی باتیں نہ کیجئے۔ اسلام، مسلمین اور قرآن مجید پر ظلم نہ کیجئے اور اپنے مذہبی تعصب کی وجہ سے بار بار تحریف قرآن کی رٹ لگا کر پوری دنیا کے مسلمانوں کے اصلی سرمائے یعنی قرآن مجید کے اعتبار کو کم نہ کیجئے۔ دشمن کو بہانہ فراہم نہ کیجئے۔ تم اگر اس طریقے سے شیعوں اور اہل بیتؑ کے پیروکاروں سے انتقام لینا چاہتے ہو تو جان لو تم جہالت

اور نادانی سے اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہو۔ کیونکہ تم کہتے ہو کہ مسلمانوں کا ایک عظیم گروہ تحریف قرآن کا قائل ہے اور یہ قرآن مجید پر ظلم عظیم ہے۔

آخر میں پھر ایک دفعہ صراحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ شیعہ اور اہل سنت کا کوئی محقق بھی تحریف قرآن کا قائل نہیں ہے بلکہ سب علماء اس قرآن مجید کو جو پیغمبر اکرم پر نازل ہوا اور جو آج مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے ایک ہی سمجھتے ہیں۔ اور خود قرآن مجید کی تصریح کے مطابق عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالی نے قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا ہے اور ہر قسم کی تحریف، تبدیلی اور زوال سے اسے محفوظ رکھنے کی ضمانت دی ہے۔

لیکن دونوں طرف سے بعض بے خبر، نا آگاہ متعصب قسم کے لوگ، ایک دوسرے کی طرف تحریف کی نسبت دیتے ہیں اور اس مسئلے کو اختلاف کے عروج تک پہنچا دیتے ہیں اللہ تعالی ان سب کو ہدایت فرمائے۔ (آمین)

۲

"تقیہ"

قرآن و سنت کے آئینہ میں

دوسرا مسئلہ جس پر ہمیشہ ہمارے متعصب مخالفین اور بہانہ تلاش کرنے والے افراد، مکتب اہلبیت کے پیروکاروں پر تشنیع کرتے ہیں، "تقیہ" کا مسئلہ ہے۔

وہ کہتے ہیں تم کیوں تقیہ کرتے ہو؟ کیا تقیہ ایک قسم کا نفاق نہیں ہے؟!

یہ لوگ اس مسئلہ کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں کہ گویا تقیہ کوئی حرام کام یا گناہ کبیرہ یا اس سے بھی بڑھ کر کوئی گناہ ہے۔ یہ لوگ اس بات سے غافل ہیں کہ قرآن مجید نے متعدد آیات میں تقیہ کو مخصوص شرائط کے ساتھ جائز شمار کیا ہے۔ اور خود انکے اپنے مصادر میں منقول روایات اس بات کی تائید کرتی ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر تقیہ (اپنی مخصوص شرائط کے ساتھ) ایک واضح عقلی فیصلہ ہے۔ خود ان کے بہت سے لوگوں نے اپنی ذاتی زندگی میں اس کا تجربہ کیا ہے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

اس بات کی وضاحت کے لیے چند نکات کی طرف توجہ ضروری ہے۔

۱۔ تقیہ کیا ہے؟

تقیہ یہ ہے کہ انسان اپنے مذہبی عقیدہ کو شدید اور متعصب مخالفین کے سامنے کہ جو اس کے لیے خطرہ ایجاد کر سکتے ہوں چھپا لے۔ مثال کے طور پر اگر ایک موحد مسلمان، ہٹ دھرم بت پرستوں کے چنگل میں پھنس جائے، اب اگر وہ اسلام اور توحید کا اظہار کرتا ہے تو وہ اس کا خون بہا دیں گے یا اسے جان، مال یا ناموس کے اعتبار سے شدید نقصان پہنچائیں گے [illegible]

حالت میں مسلمان اپنے عقیدہ کو ان سے پنہاں کر لیتا ہے تا کہ انکے گزند سے امان میں رہے یا مثلاً، اگر ایک شیعہ مسلمان کسی بیابان میں ایک ہٹ دھرم وہابی کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے جو شیعوں کا خون بہانا مباح سمجھتا ہے۔ اس حالت میں وہ مومن اگر اپنی جان، مال اور ناموس کی حفاظت کے لئے اس وہابی سے اپنا عقیدہ چھپا لیتا ہے تو ہر عاقل اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ ایسی حالت میں یہ کام مکمل طور پر منطقی ہے اور عقل بھی یہاں یہی حکم لگاتی ہے۔ کیونکہ خواہ مخواہ اپنی جان کو متعصب لوگوں کی نذر نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ تقیہ اور نفاق کا فرق:

نفاق بالکل تقیہ کے مقابلے میں ہے۔ منافق وہ ہوتا ہے جو باطن میں اسلامی قوانین پر عقیدہ نہ رکھتا ہو یا انکے بارے میں شک رکھتا ہو لیکن مسلمانوں کے درمیان اسلام کا اظہار کرتا ہو۔

جس تقیہ کے ہم قائل ہیں وہ یہ ہے کہ انسان باطن میں صحیح اسلامی عقیدہ رکھتا ہو، البتہ صرف ان شدت پسند وہابیوں کا پیروکار نہیں ہے جو اپنے علاوہ تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں اور انکے لیے کفر کا خط کھینچ دیتے ہیں اور انہیں دھمکیاں دیتے ہیں۔ جب بھی ایسا باایمان شخص اپنی جان، مال یا ناموس کی حفاظت کے لئے اس متعصب ٹولے سے اپنا عقیدہ چھپا لے اس کو تقیہ کہتے ہیں اور اسکے مقابل والا نکتہ نفاق ہے۔

۳۔ تقیہ عقل کے ترازو میں:

تقیہ حقیقت میں ایک دفاعی ڈھال ہے۔ اسی لیے ہماری روایات میں اسے (ترس

المومن) یعنی (باایمان لوگوں کی ڈھال) کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔ کسی انسان کی عقل اجازت نہیں دیتی کہ انسان اپنے باطنی عقیدہ کا خطرناک اور غیر منطقی افراد کے سامنے اظہار کرے اور خواہ مخواہ اپنی جان، مال یا ناموس کو خطرے میں ڈالے۔ کیونکہ بلاوجہ طاقت اور وسائل کو ضائع کرنا کوئی عقلی کام نہیں ہے۔

تقیہ: اس طریقہ کار کے مشابہ ہے جسے تمام فوجی، میدان جنگ میں استعمال کرتے ہیں اپنے آپ کو درختوں، سرنگوں اور ریت کے ٹیلوں کے پیچھے چھپا لیتے ہیں اور اپنا لباس درختوں کی شاخوں کے رنگ جیسا انتخاب کرتے ہیں تا کہ بلاوجہ ان کا خون ہدر نہ جائے۔

دنیا کے تمام عقلاء اپنی جان کی حفاظت کے لئے سخت دشمن کے مقابلے میں تقیہ والی روش سے استفادہ کرتے ہیں۔ کبھی بھی عقلاء، کسی کو ایسا طریقہ اپنانے پر سرزنش نہیں کریں گے۔ آپ دنیا میں ایک انسان بھی ایسا نہیں ڈھونڈ سکتے جو تقیہ کو اس کی شرائط کے ساتھ قبول نہ کرتا ہو۔

۴۔ تقیہ کتاب الٰہی میں:

قرآن مجید نے متعدد آیات میں تقیہ کو کفار اور مخالفین کے مقابلہ میں جائز قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر چند آیات پیش خدمت ہیں۔

الف) آل فرعون کے مؤمن کی داستان میں یوں بیان ہوا ہے۔

(و قال رجل مومن من آل فرعون یکتم ایمانہ اتقتلون رجلا ان یقول ربی اللہ و قد جاء کم

بالبينات ......)(۱)

آل فرعون میں سے ایک باایمان مرد نے کہ جو (موسیٰ کی شریعت پر) اپنے ایمان کو چھپاتا تھا کہا: کیا تم ایسے مرد کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا پروردگار خدا ہے اور وہ اپنے ساتھ واضح معجزات اور روشن دلائل رکھتا ہے۔

پھر مزید مؤمن کہتا ہے (اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اگر جھوٹ کہتا ہے تو اس جھوٹ کا اثر اس کے دامن گیر ہوگا اور اگر سچ کہتا ہے تو ممکن ہے بعض عذاب کی جو دھمکیاں اس نے سنائی ہیں وہ تمہارے دامن گیر ہو جائیں) پس اس طریقے سے آل فرعون کے اس مومن نے تقیہ کی حالت میں (یعنی اپنے ایمان کو مخفی رکھتے ہوئے) اس ہٹ دھرم اور متعصب ٹولے کو کہ جو حضرت موسیٰ کے قتل کے درپے تھا ضروری نصیحتیں کر دیں۔

ب) قرآن مجید کے ایک دوسرے صریح فرمان میں ہم یوں پڑھتے ہیں۔

(لايتخذ المومنون الكافرين اولياء من دون المومنين ومن يفعل ذلك فليس من الله في شئى الا ان تتقو منهم تقاة....) (۲)

مومنین کو نہیں چاہیے کہ کفار کو اپنا دوست بنائیں۔ جو بھی ایسا کریگا وہ خدا سے بیگانہ ہے ہاں مگر یہ کہ تقیہ کے طور پر ایسا کیا جائے۔

اس آیت میں دشمنان حق کی دوستی سے مکمل طور پر منع کیا گیا ہے مگر اس صورت میں اجازت ہے کہ جب ان کے ساتھ اظہار دوستی نہ کرنا مسلمان کی آزار واذیت کا سبب بنے، اس وقت ایک دفاعی ڈھال کے طور پر ان کی دوستی سے تقیہ کی صورت میں فائدہ اٹھایا جائے۔

۱) سورہ غافر آیت ۲۸۔
۲) سورہ آل عمران آیت ۲۸۔

ج) جناب عمارؓ یاسر اور انکے ماں، باپ کی داستان کو تمام مفسرین نے نقل کیا ہے۔ یہ تینوں اشخاص مشرکین عرب کے چنگل میں پھنس گئے تھے۔ اور مشرکین نے انہیں پیغمبر اکرمؐ سے اظہار براءت کرنے کو کہا۔ جناب عمارؓ کے والدین نے اعلان لاتعلقی سے انکار کیا جس کے نتیجہ میں وہ شہید ہوگئے۔ لیکن جناب عمار نے تقیہ کرتے ہوئے انکی مرضی کی بات کہدی۔ اور اس کے بعد جب گریہ کرتے ہوئے پیغمبر اکرم کی خدمت میں آئے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

(من كفر بالله من بعد ايمانه الا من اكره و قلبه مطمئن بالايمان......)(۱)

جو لوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو جائیں..... انکے لئے شدید عذاب ہے مگر وہ لوگ جنہیں مجبور کیا جائے۔

پیغمبر اکرمؐ نے جناب عمار کے والدین کو شہداء میں شمار کیا اور جناب عمار یاسر کی آنکھوں سے آنسو صاف کیے اور فرمایا تجھ پر کوئی گناہ نہیں ہے اگر پھر مشرکین تمہیں مجبور کریں تو انہی کلمات کا تکرار کرنا۔ تمام مسلمان مفسرین کا اس آیت کی شان نزول کے بارے میں اتفاق ہے کہ یہ آیت جناب عمار یاسر اور انکے والدین کے بارے میں نازل ہوئی اور بعد میں رسول خداؐ نے یہ جملات بھی ادا فرمائے۔ تو اس اتفاق سے عیاں ہو جاتا ہے کہ سب مسلمان تقیہ کے جواز کے قائل ہیں۔ ہاں یہ بات باعث تعجب ہے کہ قرآن مجید سے اتنی محکم ادلہ اور اہل سنت مفسرین کے اقوال کے باوجود شیعہ کو تقیہ کی خاطر مورد طعن قرار دیا جاتا ہے۔

۱) سورۃ النحل آیت ۱۰۶۔

جی ہاں نہ تو جناب عمارؓ منافق تھے نہ ہی آل فرعون کا وہ مومن منافق تھا بلکہ تقیہ کے دستور الٰہی سے انہوں نے فائدہ اٹھایا۔

۵۔ تقیہ اسلامی روایات میں:

اسلامی روایات میں بھی تقیہ کا کثرت سے ذکر ملتا ہے۔ مثال کے طور پر مسند ابی شیبہ اہل سنت کی معروف مسند ہے۔ اس میں (مسیلمہ کذاب) کی داستان میں نقل ہوا ہے کہ مسیلمہ کذاب نے رسول خداؐ کے دو اصحاب کو اپنے اثر و رسوخ والے علاقے میں گرفتار کرلیا اور دونوں سے سوال کیا کہ کیا تم گواہی دیتے ہو کہ میں خدا کا نمائندہ ہوں؟! ایک نے گواہی دے کر اپنی جان بچالی اور دوسرے نے گواہی نہیں دی تو اسکی گردن اڑادی گئی۔ جب یہ خبر رسول خداؐ تک پہنچی تو آپؐ نے فرمایا جو قتل ہو گیا اس نے صداقت کے راستے پر قدم اٹھایا اور دوسرے نے رخصت الٰہی کو قبول کرلیا اور اس پر کوئی گناہ نہیں ہے (۱)

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی احادیث میں بھی بالخصوص ان ائمہ کے کلمات میں کہ جو بنو عباس اور بنو امیہ کی حکومت کے زمانہ میں زندگی بسر کرتے تھے اور اس دور میں جہاں کہیں محب علیؑ اسے قتل کردیا جاتا تھا۔ تقیہ کا حکم کثرت سے ملتا ہے۔ کیونکہ وہ مامور تھے کہ ظالم اور بے رحم دشمنوں سے اپنی جان بچانے کے لئے تقیہ کی ڈھال سے استفادہ کریں۔

۶۔ کیا تقیہ صرف کفار کے مقابلے میں ہے؟

ہمارے بعض مخالفین جب ان واضح آیات اور مندرجہ بالا روایات کا سامنا کرتے ہیں تو اسلام میں تقیہ کے جواز کو قبول کرنے کے علاوہ اکے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ اس وقت وہ

۱) مسند ابی شیبہ، ج ۱۲ص ۳۵۸۔

یوں راہ فرار تلاش کرتے ہیں کہ تقیہ تو صرف کفار کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے مقابلے میں تقیہ جائز نہیں ہے۔ حالانکہ مندرجہ بالا ادلہ کی روشنی میں بالکل واضح ہے کہ ان دو موارد میں کوئی فرق نہیں ہے۔

ا۔ اگر تقیہ کا مفہوم متعصب اور خطرناک افراد کے مقابلے میں اپنی جان، مال اور ناموس کی حفاظت کرنا ہے، اور حقیقت میں بھی یونہی ہے، تو پھر نا آگاہ اور متعصب مسلمان اور کافر کے درمیان کیا فرق ہے؟ اگر عقل وخرد یہ حکم لگاتی ہے کہ ان امور کی حفاظت ضروری ہے اور انہیں بیہودہ طور پر ضائع کرنا مناسب نہیں ہے تو پھر ان دو مقامات میں کیا فرق ہے۔

دنیا میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جو انتہائی جہالت اور غلط پروپیگنڈہ کی وجہ سے کہتے ہیں کہ شیعہ کا خون بہانا قربت الٰہی کا ذریعہ بنتا ہے۔ اب اگر کوئی مخلص شیعہ جو امیر المومنین علیہ السلام کا حقیقی پیروکار ہو اور اس جنایت کار ٹولے کے ہاتھوں گرفتار ہوجائے اور وہ اس سے پوچھیں کہ بتا تیرا مذہب کیا ہے؟ اب اگر یہ شخص واضح بتادے کہ میں شیعہ ہوں تو یہ خواہ مخواہ اپنی گردن کو جہالت کی تلوار کے سپرد کرنے کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟ کوئی بھی صاحب عقل وخرد یہ حکم لگا سکتا ہے؟

بالفاظ دیگر جو کام مشرکین عرب نے جناب عمار و یاسر یا مسیلمہ کذاب کے پیروکاروں نے دو اصحاب رسول خدا کے ساتھ کیا اگر وہی کام بنو امیہ اور بنو عباس کے خلفاء اور جاہل مسلمان، شیعوں کے ساتھ انجام دیں تو کیا ہم تقیہ کو حرام کہیں اور اہل بیت علیہم السلام کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں مخلص پیروکاروں کی نابودی کے اسباب فراہم کریں صرف اس خاطر کہ یہ حاکم بظاہر مسلمان تھے؟!!

اگر ائمہ اہل بیت علیہم السلام تقیہ کے مسئلہ پر بہت زیادہ تاکید نہ کرتے یہاں تک کہ فرمایا ہے

(تسعة اعشار الدين التقيه) دس میں سے نو حصے دین تقیہ ہے۔(۱)

تو بنو امیہ اور بنو عباس کے دور میں شیعوں کے مقتولین کی تعداد شاید لاکھوں بلکہ کروڑوں تک پہنچ جاتی۔ یعنی انکی بے رحمانہ اور وحشیانہ قتل و غارت دسیوں گنا زیادہ ہو جاتی۔

آیا ان شرائط میں تقیہ کی مشروعیت کے بارے میں ذرہ برابر شک رہ جاتا ہے؟ ہم یہ بات فراموش نہیں کر سکتے کہ جب اہل سنت بھی سالہا سال مذہبی اختلافات کی خاطر ایک دوسرے سے تقیہ کرتے تھے۔ من جملہ قرآن مجید کے حادث یا قدیم ہونے پر انکا شدید اختلاف تھا اور اس راہ میں بہت ساروں کا خون بہایا گیا! (وہی نزاع کہ جو آج محققین کی نظر میں بالکل بیہودہ اور بے معنی نزاع ہے) کیا جو گروہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا تھا اگر ان میں سے کوئی شخص مخالفین کے چنگل میں گرفتار ہو جاتا تو کیا اسے صراحت کے ساتھ کہہ دینا چاہیے کہ میرا یہ عقیدہ ہے چاہے اس کا خون بہہ جائے اور اس کے خون بہنے کا نہ کوئی فائدہ ہو اور نہ کوئی تاثیر؟!

۲۔ جناب فخر رازی اس آیت (الا ان تتقوا منهم تقاة) (۲) کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ آیت کا ظہور یہ ہے کہ تقیہ غالب کافروں کے مقابلے میں جائز ہے (الا ان مذهب الشافعي رض. ان الحالة بين المسلمين اذا شاكلت الحالة بين المسلمين و المشركين حلّت التقيه محاماة على النفس) لیکن مذہب شافعی یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی کیفیت بھی ایک دوسرے کے ساتھ مسلمین و کفار جیسی ہو جائے تو اپنی جان کی حفاظت کے لئے تقیہ جائز ہے۔

---

۱) بحار الانوار، جلد ۱۰۹، ص ۲۵۴۔
۲) سورۂ آل عمران آیہ ۲۸۔

اس کے بعد حفظ مال کی خاطر تقیہ کے جواز پر دلیل پیش کرتے ہیں کہ حدیث نبوی ہے (حرمة مال المسلم كحرمة دمه) مسلمان کے مال کا احترام اس کے خون کی مانند ہے) اور اسی طرح دوسری حدیث میں ہے (من قتل دون ماله فهو شهيد) جو اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے (۱)۔

تفسیر نیشاپوری میں کہ جو تفسیر طبری کے حاشیہ پر لکھی گئی ہے یوں بیان کیا گیا ہے کہ قال الامام الشافعي:

(تجوز التقيه بين المسلمين كما تجوز بين الكافرين محاماة عن النفس) (۲)

امام شافعی فرماتے ہیں کہ جان کی حفاظت کی خاطر مسلمانوں سے تقیہ کرنا بھی جائز ہے۔ جس طرح کفار سے تقیہ کرنا جائز ہے۔

۳۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بنی عباس کی خلافت کے دور میں بعض اہل سنت محدثین (قرآن مجید کے قدیم ہونے) پر عقیدہ رکھنے کی وجہ سے بنو عباس کے حکام کی طرف سے دباؤ کا شکار ہوئے انہوں نے تقیہ کرتے ہوئے اعتراف کرلیا کہ قرآن مجید حادث ہے اور اس طرح انہوں نے اپنی جان بچالی۔

"ابن سعد" مشہور مورخ کتاب طبقات میں اور طبری ایک اور مشہور مورخ اپنی تاریخ کی کتاب میں دو خطوط کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جو مامون کی طرف سے اسی مسئلہ کے بارے میں بغداد کے پولیس افسر (اسحق بن ابراہیم) کی طرف ارسال کیے گئے۔

---

۱) تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۸، ص ۱۳۔
۲) تفسیر نیشاپوری (تفسیر الطبری کے حاشیہ پر) جلد ۳، ص ۱۱۸۔

پہلے خط کے بارے میں ابن سعد یوں لکھتا ہے کہ مامون نے پولیس افسر کو لکھا کہ سات مشہور محدثین (محمد بن سعد کاتب واقدی۔ ابو مسلم۔ یحیی بن معین۔ زہیر بن حرب۔ اسمٰعیل بن داوود۔ اسمٰعیل بن ابی مسعود۔ واحمد بن الدورقی) کو حفاظتی اقدامات کے ساتھ میری طرف بھیج دو۔ جب یہ افراد مامون کے پاس پہنچے تو اس نے ان سے آزمانے کے لیے سوال کیا کہ قرآن مجید کے بارے میں تمہارا عقیدہ کیا ہے؟ تو سب نے جواب دیا کہ قرآن مجید مخلوق ہے (حالانکہ اس وقت محدثین کے درمیان مشہور نظریہ اس کے برعکس تھا یعنی قرآن مجید کے قدیم ہونے کے قائل تھے اور ان محدثین کا بھی یہی عقیدہ تھا (۱) ہاں انہوں نے مامون کی سخت سزاؤں کے خوف سے تقیہ کیا اور قرآن مجید کے مخلوق ہونے کا اعتراف کرلیا اور اپنی جان بچالی۔ مامون کے دوسرے خط کے بارے میں کہ جسے طبری نے نقل کیا ہے اور وہ بھی بغداد کے پولیس افسر کے نام تھا یوں پڑھتے ہیں کہ جب مامون کا خط اس کے پاس پہنچا تو اس نے بعض محدثین کو کہ جنکی تعداد شاید ۲۶ چھبیس افراد تھی حاضر کیا اور مامون کا خط انکے سامنے پڑھا۔ پھر ہر ایک کو الگ الگ پکار کر قرآن مجید کے بارے میں اُسکا عقیدہ معلوم کیا۔ ان میں سوائے چار افراد کے سب نے اعتراف کیا کہ قرآن مجید مخلوق ہے (اور تقیہ کر کے اپنی جان بچالی) جن چار افراد نے اعتراف نہیں کیا انکے نام یہ تھے احمد ابن حنبل، سجادہ، القواریری، اور محمد بن نوح۔ پولیس انسپکٹر نے حکم دیا کہ انہیں زنجیروں میں جکڑ کر زندان میں ڈال دیا جائے۔ دوسرے دن دوبارہ ان چاروں افراد کو بلایا اور قرآن مجید کے بارے میں اپنے سوال کا تکرار کیا۔ سجادہ نے اعتراف کرلیا کہ قرآن مجید مخلوق ہے وہ آزاد ہو

---

۱) طبقات ابن سعد، جلد ۷، ص ۱۶۷، چاپ بیروت۔

گیا۔ باقی تین نے مخالفت پر اصرار کیا، انہیں دوبارہ زندان بھیج دیا گیا۔ اگلے دن پھر ان تین افراد کو بلایا گیا اس مرتبہ (القواریری) نے اپنا بیان واپس لے لیا اور آزاد ہوگیا۔ لیکن احمد ابن حنبل اور محمد بن نوح اسی طرح اپنے عقیدہ پر مصر رہے۔ پولیس انسپکٹر نے انہیں (طرطوس) (۱) شہر میں جلاوطن کردیا۔

جب کچھ لوگوں نے ان تقیہ کرنے والوں پر اعتراض کیا تو انہوں نے کفار کے مقابلے میں جناب عمار یاسر کے عمل کو دلیل کے طور پر پیش کیا (۲) ان موارد سے بالکل روشن ہوجاتا ہے کہ جس وقت انسان کسی چنگل میں گرفتار ہوجائے اور اس وقت ظالموں سے نجات پانے کا تنہا راستہ تقیہ ہو تو وہ یہ راستہ اختیار کرسکتا ہے خواہ یہ تقیہ کافر کے مقابلہ میں ہو یا مسلمان کے مقابلے میں ہو۔

۷) حرام تقیہ:

بعض موارد میں تقیہ حرام ہے اور یہ اس وقت ہے کہ جب ایک فرد یا گروہ کے تقیہ کرنے اور اپنا مذہبی عقیدہ چھپانے سے اسلام کی بنیاد کو خطرہ لاحق ہوتا ہو یا مسلمانوں کو شدید نقصان ہوتا ہو۔ اس وقت اپنے حقیقی عقیدہ کو ظاہر کرنا چاہیے، چاہے ان کے لئے خطرے کا باعث ہی کیوں نہ ہو۔ اور جو لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے اور قرآن مجید نے صراحت کے ساتھ اس سے منع فرمایا ہے (ولا تلقو بایدیکم الی التھلکۃ) یہ

---

۱) یہ شام میں دریا کے کنارے ایک شہر ہے (معجم البلدان جلد ۴، ص ۳۰)۔

۲) تاریخ طبری جلد ۷، ص ۱۹۷۔

لوگ سخت خطاء سے دوچار ہیں کیونکہ اس کا لازمہ یہ ہے کہ میدان جہاد میں حاضر ہونا بھی حرام ہو حالانکہ کوئی بھی عاقل ایسی بات نہیں کرتا ہے۔ یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ یزید کے مقابلے میں امام حسین علیہ السلام کا قیام یقیناً ایک دینی فریضہ تھا۔ اسی لئے امام علیہ السلام تقیہ کے طور پر بھی یزیدیوں اور بنوامیہ کے غاصب خلفاء کے ساتھ کسی قسم کی نرمی دکھانے پر راضی نہ ہوئے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایسا کرنے سے اسلام کی بنیاد کو شدید دھچکا لگے گا۔ آپؑ کا قیام اور آپکی شہادت مسلمانوں کی بیداری اور اسلام کو جاہلیت کے چنگل سے نجات دلانے کا باعث بنی۔

(مصلحت آمیز) تقیہ: یہ تقیہ کی ایک دوسری قسم ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ ایک مذہب والے، مسلمانوں کی صفوں میں وحدت برقرار رکھنے کے لئے ان باتوں میں جن سے دین ومذہب کی بنیاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، دوسرے تمام فرقوں کے ساتھ ہماہنگی اور یکجہتی کا ثبوت دیتے ہیں۔ مثلاً مکتب اہل بیت علیہم السلام کے پیروکار یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کپڑے اور قالین پر سجدہ نہیں ہوتا اور پتھر یا مٹی وغیرہ پر سجدہ کرنا ضروری ہے۔ اور پیغمبر اکرم کی اس مشہور حدیث (جعلت لی الارض مسجداً و طهوراً) (۱) ''زمین کو میرے لئے محل سجدہ اور وسیلہ تیمم قرار دیا گیا ہے'' کو اپنی دلیل قرار دیتے ہیں اب اگر وہ وحدت برقرار رکھنے کیلئے دیگر مسلمانوں کی صفوں میں انکی مساجد میں یا مسجد الحرام اور مسجد نبوی میں جب نماز پڑھتے ہیں تو ناگزیر کپڑے پر سجدہ کرتے ہیں۔ یہ کام جائز ہے اور ایسی نماز ہمارے عقیدہ کے مطابق

۱) صحیح بخاری جلد۱ ص۱۹۱ و سنن بیہقی، جلد۲ ص۴۳۳ (اور بھی بہت سی کتب میں یہ حدیث نقل ہوئی ہے)۔

درست ہے اور اسے ہم مدارا کرنے والا (مصلحت آمیز) تقیہ کہتے ہیں۔ کیونکہ اس میں جان ومال کا خوف درکار نہیں ہے بلکہ اس میں تمام اسلامی فرقوں کے ساتھ مدارا کرنے اور حسن معاشرت کا عنوان درپیش ہے۔ تقیہ کی بحث کا ایک بزرگ عالم دین کے کلام کے ساتھ اختتام کرتے ہیں۔

ایک شیعہ عالم دین کی مصر میں الازہر کے ایک بزرگ استاد سے ملاقات ہوئی اس نے شیعہ عالم کو سرزنش کرتے ہوئے کہا میں نے سنا ہے تم لوگ تقیہ کرتے ہو؟ شیعہ عالم دین نے جواب میں کہا (لعن الله من حملنا علی التقية) رحمت الٰہی سے دور ہوں وہ لوگ جنہوں نے ہمیں تقیہ پر مجبور کیا! (۱)

۱) یعنی اگر دشمنوں کی طرف سے ہماری جان ومال کو خطرہ نہ ہوتا تو ہم کبھی بھی تقیہ نہ کرتے (مترجم)

۳

عدالت صحابه

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب خصوصی امتیازات سے بہرہ مند تھے۔ وحی الٰہی اور آیات کو پیغمبر اکرمؐ کی زبان مبارک سے سنتے تھے۔ آنحضرتؐ کے معجزات کا مشاہدہ کرتے تھے۔ اور آپکی قیمتی باتوں کے ذریعے پرورش پاتے تھے آنحضرتؐ کے عملی نمونوں اور اسوہ حسنہ سے بہرہ مند تھے۔

اسی وجہ سے انکے درمیان ایسی بزرگ اور ممتاز شخصیات نے تربیت پائی کہ جہان اسلام جنکے وجود پر فخر و مباہات کرتا ہے۔ لیکن اہم مسئلہ یہ ہے کہ کیا تمام اصحاب بغیر کسی استثناء کے مومن، صالح، سچے، درستکار اور عادل افراد تھے یا ان کے درمیان غیر صالح افراد بھی موجود تھے۔

۱۔ دو متضاد عقیدے:

صحابہ کے بارے میں دو مختلف عقیدے موجود ہیں: پہلا عقیدہ یہ کہ تمام اصحاب بغیر کسی استثناء کے پاکیزگی و طہارت کے نور سے منور ہیں اور سب ہی صالح، عادل، باتقویٰ اور صادق تھے۔ اسی وجہ سے ان میں سے جو بھی پیغمبر اکرمؐ سے حدیث نقل کرے صحیح اور قابل قبول ہے۔ اور ان پر کوئی چھوٹا سا اعتراض بھی نہیں کیا جاسکتا ہے اور اگر ان سے غلط کام سرزد ہوجائے تو ان کی توجیہ کرنا چاہیے۔ یہ اہل سنت کے اکثر گروہوں کا عقیدہ

دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر چہ ان کے درمیان باشخصیت، فداکار، پاک اور باتقویٰ افراد موجود تھے لیکن منافق اور غیر صالح افراد بھی موجود تھے۔ اور قرآن مجید اور پیغمبر اکرمؐ نے ان سے اظہار بیزاری کیا ہے۔

باالفاظ دیگر اچھے اور برے کی تشخیص کا جو معیار ہر جگہ استعمال ہوتا ہے وہی معیار ہم یہاں بھی جاری کریں گے۔ ہاں چونکہ یہ پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب تھے اس لئے ان کے بارے میں ہمارا اصلی و بنیادی نظریہ یہ ہوگا کہ یہ نیک و پاک افراد ہیں، لیکن اس کے باوجود ہم حقائق سے ہرگز چشم پوشی نہیں کریں گے۔ اور عدالت وصدق سے منافی اعمال کے صدور پر غض بصر نہیں کریں گے۔ چونکہ یہ کام، اسلام اور مسلمین پر ایک کاری ضرب لگاتا ہے اور اسلام کی چار دیواری میں منافقین کے داخلہ کا سبب بنتا ہے۔

مذہب شیعہ اور اہلسنت کے روشن فکر علماء کے ایک گروہ نے اس عقیدہ کا انتخاب کیا ہے۔

۲۔ تنزیہ کے سلسلہ میں شدت پسندی:

تنزیہ صحابہ والے نظریہ کے طرفداروں کے ایک گروہ نے اتنی شدت اختیار کی ہے کہ جو بھی اصحاب پر تنقید کردے اسے فاسق اور کبھی ملحد اور زندیق شمار کرتا ہے اور یا اس کا خون بہانا مباح سمجھتا ہے۔

من جملہ ابوزرعہ رازی کی کتاب "الاصابۃ" میں یوں ملتا ہے: "اگر دیکھو کوئی شخص اصحاب پیغمبرؐ میں سے کسی پر تنقید کررہا ہے تو جان لو کہ وہ زندیق ہے۔ یہ فتویٰ اس لئے ہے چونکہ رسول خداؐ حق اور قرآن حق ہے اور جو کچھ پیغمبر پر نازل ہوا حق ہے اور ان تمام چیزوں کو

صحابہ نے ہم تک پہنچایا ہے اور یہ (مخالفین) چاہتے ہیں ہمارے شہود (گواہوں) کو بے اعتبار کردیں تاکہ کتاب وسنت ہاتھ سے چلی جائے!"(۱)

"عبداللہ موصلی" اپنی کتاب "حتیٰ لا نخدع" میں یوں رقمطراز ہیں: "یہ اصحاب ایسا گروہ ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی ہم نشینی اور دین وشریعت کے قوام کے لیے چن لیا ہے۔ اور انہیں پیغمبر کا وزیر قرار دیا ہے۔ انکی محبت کو دین و ایمان اور انکے بغض کو کفر و نفاق شمار کیا ہے! اور امت پر واجب کیا ہے کہ ان سب کو دوست رکھیں اور ہمیشہ انکی خوبیاں اور فضائل بیان کریں اور انکی آپس میں جو جنگیں اور جھگڑے ہوئے ہیں ان پر خاموشی اختیار کریں!"(۲)

عنقریب روشن ہوجائیگا کہ یہ بات قرآن وسنت کے خلاف ہے۔

۳۔ لاجواب سوالات:

ہر عقلمند اور منصف مزاج انسان جو ہر بات کو بغیر دلیل اور آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کرتا اپنے آپ سے یہ سوالات کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ازواج پیغمبرؐ کے بارے میں یوں فرماتا ہے کہ:

"یٰنِسَاءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْکُنَّ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ یُّضٰعَفْ لَہَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ وَکَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرًا"(۳)

۱) الاصابہ جلد ۱ ص ۱۷۔
۲) حتیٰ لا نخدع ص ۱۹۔
۳) سورۂ احزاب آیت ۳۰۔

اے ازواج رسول تم میں سے جس نے بھی کھلم کھلا گناہ کیا اس کی سزا دو برابر ہوگی اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے لیے انتہائی آسان ہے۔

ہم صحابہ کی جو بھی تفسیر کریں (عنقریب اصحاب کی مختلف تعریفیں بیان ہونگی) بلاشک ازواج نبیؐ اصحاب کا روشن ترین مصداق ہیں۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ انکے گناہوں سے چشم پوشی نہیں کی جائے گی بلکہ انکی سزا دو برابر ہوگی۔

کیا ہم اس آیت پر یا نظریہ تنزیہ کے طرفداروں کی بلا مشروط حمایت پر یقین رکھیں؟

نیز قرآن مجید، شیخ الانبیاء حضرت نوحؑ کے فرزند کے بارے میں اس کی غلطیوں کی وجہ سے یوں فرماتا ہے "إنه عملٌ غيرُ صالحٍ" وہ غیر صالح عمل ہے۔(۱)

اور جناب نوحؑ کو خبردار کیا گیا کہ اس کی شفاعت نہ کریں!

کیا ایک نبی کا فرزند اہم ہوتا ہے یا اس کے اصحاب واعوان؟

حضرت نوح اور لوط علیہما السلام کی بیویوں کے بارے میں قرآن مجید یوں کہتا ہے:

"و فخانتاهما فلم يغنيا عنهما من الله شيئا و قيل ادخلا النار مع الداخلين"(۲)

ان دو نے اپنے شوہروں (نوحؑ اور لوطؑ) کے ساتھ خیانت کی (اور دشمنوں کا ساتھ دیا) اور وہ دو پیغمبر انکی شفاعت نہ کر سکے اور ان دونوں کو حکم دیا گیا کہ دوزخیوں کے ساتھ آگ میں داخل ہو جاؤ۔

---

۱) سورۂ ہود آیت ۴۶۔

۲) سورۂ تحریم آیت ۱۰۔

کیا یہ آیات صراحت کے ساتھ بیان نہیں کر رہیں کہ افراد کی خوبی اور بدی کا معیار انکا اپنا ایمان اور عمل ہے۔ حتیٰ کہ اگر برے اعمال ہوں تو نبی کی بیوی یا بیٹا ہونا بھی جہنم میں جانے سے نہیں روک سکتا۔

اس کے باوجود کیا صحیح ہے کہ ہم آنکھیں بند کر لیں اور کہیں کہ فلاں شخص چونکہ کچھ عرصہ کے لیے نبی کا صحابی رہا ہے لہٰذا اس کی محبت دین وایمان اور اس کی مخالفت کفر ونفاق ہے۔ چاہے وہ صحابی بعد میں منافقین کی صف میں داخل ہو گیا ہو اور اس نے نبی اکرم کا دل دکھایا ہو اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہو۔ کیا عقل وخرد اس بات کو قبول کرتی ہے؟

اگر کوئی کہے کہ طلحہ وزبیر ابتدائے اسلام میں اچھے انسان تھے لیکن جس وقت حکومت کی ہوس ان پر سوار ہوئی تو انہوں نے زوجۂ رسولؐ (حضرت عائشہ) کو اپنے ساتھ لیا اور حضرت علیؑ کے ساتھ اپنی بیعت و پیمان توڑ ڈالی حالانکہ تقریباً تمام مسلمانوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ پھر انہوں نے جنگِ جمل کی آتش کو بھڑکایا اور اس طرح سترہ ہزار مسلمان اس جنگ کا لقمہ بن گئے۔ پس یہ لوگ راہ راست سے منحرف ہو گئے تھے اور اس عظیم تعداد کا خون انکی گردن پر ہے اور قیامت کے دن یہ جوابدہ ہونگے۔

کیا یہ بات حقیقت کے خلاف ہے؟!

یا اگر کوئی کہے کہ چونکہ معاویہ نے حضرت علیؑ کی بیعت کی خلاف ورزی کی اور جس خلافت کو تمام مسلمانوں نے قبول کر لیا تھا تو اس نے انکار کیا اور جنگِ صفین کی آگ بھڑکائی جس میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان لقمہ اجل بن گئے۔ لہٰذا معاویہ ستمگر آدمی تھا۔ کیا یہ بات ناحق ہے؟!

کیا تاریخ کے ان تلخ حقائق سے چشم پوشی کی جاسکتی ہیں۔ یا ان غلط توجیہات کی خاطر جنہیں کوئی بھی عقلمند آدمی قبول نہیں کرتا ان نہایت افسوس ناک حوادث سے صرف نظر کیا جاسکتا ہے؟ کیا "عبداللہ موصلی کے بقول ایسے افراد کی محبت، دین وایمان ہے اور ان کا بغض کفر ونفاق ہے؟!

کیا ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ان غلط کاموں کے سامنے جو ہزاروں مسلمانوں کے قتل کے موجب بنے ہیں سکوت اختیار کریں؟ کونسی عقل یہ حکم لگاتی ہے؟ قرآن مجید کہتا ہے کہ پیغمبر اکرم کے گرد جمع ہونے والوں میں منافق لوگ بھی تھے کیا ان آیات قرآن سے چشم پوشی کرلیں؟

قرآن مجید یوں فرماتا ہے:

"وممّن حولکم من الأعرابِ مُنافقونَ و مِنْ أهلِ المدينة مَرَدُوا على النّفاق لاتعلمُهُم نحنُ نعلمُهُم......"(۱)

کیا آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ اس قسم کی منطق کو دنیا کے عقلمند انسان قبول کرلیں؟

۴: صحابہ کون ہیں؟

اس مقام پر ایک اور اہم نکتہ مفہوم "صحابہ" ہے۔

صحابہ کہ جن کے بارے میں طہارت و پاکیزگی کی بات کی جاتی ہے تو مسئلہ یہ ہے کہ ان سے کون لوگ مراد ہیں۔ اس سلسلہ میں علمائے اہل سنت کی جانب سے مکمل طور پر مختلف تعریفیں بیان کی گئی ہیں۔

۱) سورۂ توبہ، آیت ۱۰۱۔

۱۔ بعض نے تو اس کے مفہوم کو بہت وسیع کردیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں سے جس نے بھی آنحضرتؐ کو دیکھا ہے وہ آپ کا صحابی ہے!

اسی تعبیر کو "بخاری" نے ذکر کیا ہے وہ یوں لکھتے ہیں" من صَحِبَ رسولَ الله او رآه من المسلمين فهو من أصحابه!"

اہل سنت کے معروف عالم جناب احمد بن حنبل نے بھی صحابی کے مفہوم کو بہت وسیع بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں "اصحابُ رسول الله كلُّ من صحبه، شهراً أوْ يوماً أوْ ساعةً أوْ رآه"

"رسولخداؐ کا صحابی وہ ہے کہ جس نے رسولخداؐ کی صحبت اختیار کی ہو چاہے ایک ماہ ایک دن یا حتی ایک گھنٹے کیلئے بھی بلکہ اگر کسی نے آنحضرتؐ کی زیارت کی ہو وہ بھی صحابی ہے!"

۲۔ بعض علماء نے صحابی کی تعریف کو محدود انداز میں پیش کیا ہے مثلاً "قاضی ابوبکر محمد ابن الطیب" لکھتے ہیں کہ اگرچہ صحابی کا لغوی معنیٰ عام ہے لیکن اُمت کے عرف عام میں اس اصطلاح کا اطلاق صرف اُن افراد پر ہوتا ہے جو کافی عرصہ تک آنحضرتؐ کی صحبت میں رہے ہوں نہ ان لوگوں پر کہ جو صرف ایک گھنٹہ کی محفل میں بیٹھا ہو یا آپؐ کے ساتھ چند قدم تک چلا ہو یا اس نے ایک آدھ حدیث آنحضرتؐ سے سُن لی ہو"۔

۳۔ بعض علماء نے صحابی کی تعریف کا دائرہ اس سے بھی زیادہ تنگ کردیا ہے جیسے "سعید بن المسیب" لکھتے ہیں کہ "پیغمبرؐ کا صحابی وہ ہے جو کم از کم ایک یا دو سال آنحضرتؐ کے ساتھ رہا ہو اور ایک یا دو غزووں میں اس نے آنحضرتؐ کے ساتھ شرکت کی ہو"(۱)

۱) تفسیر قرطبی، جلد ۸، ص ۲۳۷۔

ان تعاریف اور دیگر تعریفوں میں کہ جنہیں طوالت کے خوف کیوجہ سے ذکر نہیں کیا جارہا ہے مشخص نہیں ہے کہ اس قداست کے دائرے میں آنے والے افراد کون سے ہیں۔ اکثر علماء نے اسی وسیع معنیٰ کو اختیار کیا ہے۔ اگرچہ ہماری مدنظر ابحاث میں ان تعریفوں کے اختلاف سے زیادہ فرق نہیں پڑتا ہے۔ جیسا کہ عنقریب روشن ہو جائیگا کہ سیرت رسول کی خلاف ورزی کرنیوالے اکثر وہ افراد ہیں جو کافی عرصہ تک آپؐ کے ہمنشین رہے ہیں۔

۵: ''عقیدہ تنزیہ کا اصلی سبب''

اس کے باجود کہ اصحاب کی اس حد تک پاکیزگی کا عقیدہ رکھنا کہ جو بعض لحاظ سے عصمت کے مشابہ ہے نہ تو قرآن مجید میں اس کا حکم آیا ہے نہ احادیث میں بلکہ قرآن، سنت اور تاریخ سے اس کے برعکس مطلب ثابت ہے حتیٰ کہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلی صدی میں اس قسم کا کوئی عقیدہ موجود نہیں تھا۔ تو پھر دیکھنا یہ ہے کہ بعد والی صدیوں میں یہ مسئلہ کیوں اور کس دلیل کی بنا پر پیش کیا گیا ہے؟

ہمارے خیال کے مطابق اس عقیدہ کے انتخاب کی چند وجوہات تھیں

ا۔ اگر کمال حُسن ظن سے کام لیا جائے تو ایک وجہ تو یہی ہے جسے سابقہ ابحاث میں ذکر کیا گیا ہے کہ بعض لوگ گمان کرتے ہیں کہ اگر صحابہ کرام کا تقدس پائمال ہو جائے تو انکے اور پیغمبرؐ کے درمیان حلقۂ اتصال ٹوٹ جائے گا۔ کیونکہ قرآن مجید اور پیغمبر اکرمؐ کی سنت انکے واسطہ سے ہم تک پہنچی ہے۔

لیکن اس بات کا جواب بالکل واضح ہے کیونکہ کوئی بھی مسلمان معاذ اللہ تمام اصحاب کو غلط اور کاذب نہیں کہتا ہے کیونکہ انکے درمیان ثقہ اور مورد اطمینان افراد کثرت کے ساتھ

تھے، وہی با اعتماد افراد ہمارے اور پیغمبر اکرمؐ کے درمیان حلقۂ اتصال بن سکتے ہیں۔ جس طرح ہم شیعہ، اہلبیتؑ کے اصحاب کے بارے میں یہی نظریہ رکھتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ بعد والی صدیوں میں بھی یہی مشکل موجود ہے کیونکہ آج ہم کئی واسطوں کے ذریعے اپنے آپ کو زمانہ پیغمبرؐ کے ساتھ متصل کرتے ہیں۔ لیکن کسی نے دعویٰ نہیں کیا کہ یہ تمام واسطے، ثقہ اور صادق ہیں اور ہر صدی کے لوگ بڑے مقدس تھے اور اگر ایسا نہ ہو تو ہمارا دین متزلزل ہو جائیگا۔

بلکہ سب یہی کہتے ہیں کہ روایات کو ثقہ اور عادل افراد سے اخذ کرنا چاہیے۔

علم رجال کی کتب تحریر کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ثقہ کو غیر ثقہ سے ممتاز کیا جاسکے۔

تو اب کیا مشکل ہے کہ اصحاب کرام کے بارے میں بھی ہم وہی طریقہ عمل اختیار کریں جو ان سے بعد والوں کے بارے میں اختیار کرتے ہیں؟!

۲۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ بعض صحابہ کے بارے میں ''جرح'' یعنی انکے نقائص بیان کرنے اور ان پر تنقید کرنے سے پیغمبر اسلامؐ کے مقام و منزلت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اس لیے اصحاب پر تنقید جائز نہیں ہے۔

جو لوگ اس دلیل کا سہارا لیتے ہیں ان سے ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا قرآن مجید نے پیغمبرؐ کے گرد جمع ہونے والے منافقین پر شدید ترین حملے نہیں کیے ہیں؟ کیا آنحضرتؐ کے خالص اور صادق اصحاب کے درمیان منافقین کی موجودگی کی وجہ سے آپؐ کی شان میں کمی واقع ہوئی ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہے!

خلاصہ یہ کہ ہمیشہ اور ہر زمانے میں حتیٰ تمام انبیاء کے زمانوں میں اچھے اور بُرے افراد

موجود تھے۔ اور انبیاء کے مقام و منزلت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

۳۔ اگر اصحاب کے اعمال پر جرح و تنقید کا سلسلہ شروع ہو جائے تو بعض خلفاء راشدین کی شخصیت پر حرف آتا ہے۔ اس لئے ان کے تقدس کی حفاظت کیلئے صحابہ کی قداست پر تاکید کرنا چاہیے تاکہ کوئی شخص مثلاً حضرت عثمان کے اُن کاموں پر اعتراض نہ کرے جو بیت المال کے بارے میں اور اس کے علاوہ ان کے دور حکومت میں وقوع پذیر ہوئے اور یہ نہ کہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔

یہاں تک کہ اس قداست کے قالب میں معاویہ اور اس کے اقدامات؛ جیسے کہ اس نے خلیفۂ رسول حضرت علی علیہ السلام کی مخالفت کی اور اُن کے ساتھ جنگیں کیں اور مسلمانوں کے قتل عام کا موجب بنا؛ کی توجیہ کی جاسکے، اور اس ہتھیار کے ذریعے ایسے افراد کو تنقید سے بچایا جاسکے۔ البتہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس قداست والے مسئلہ کی بنیاد ابتدائی صدیوں کے سیاستدانوں نے رکھی۔ جسطرح انہوں نے کلمہ "اولی الامر" کی تفسیر "حاکم وقت" کی تاکہ بنوامیہ اور بنوعباس کے ظالم حکام کی اطاعت کو بھی ثابت کیا جاسکے نیز یہ حکام کا سیاسی پروگرام اور لائحہ عمل تھا۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ ایسی باتوں سے ان کا مقصد سب صحابہ کو بچانا نہ تھا بلکہ اپنے مورد نظر افراد کی حمایت مقصود تھی۔

۴۔ بعض لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اصحاب کے تقدس کا عقیدہ قرآن مجید اور سنت نبوی کے فرمان کے مطابق ہے کیونکہ قرآن مجید کی بعض آیات اور بعض احادیث میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔

اگرچہ یہ بہترین توجیہ ہے لیکن جب ہم ادلہ کی تحقیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات و روایات میں جس چیز کو وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں موجود نہیں ہے۔ سب سے اہم آیت

جس کو دلیل کے طور پر ذکر کیا گیا ہے مندرجہ ذیل آیت ہے:

"و السابقون الاولون من المهاجرین و الانصار و الذین اتبعوهم باحسان رضی الله عنهم و رضوا عنه و اعدّ لهم جنّات تجری تحتها الانهار خالدین فیها ابداً ذلک الفوز العظیم" (۱)

مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے اور جنہوں نے نیکی کے ساتھ انکی پیروی کی اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے اور وہ خدا سے راضی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انکے لئے باغات تیار کر رکھے ہیں جنکے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں یہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

اہلسنت کے بہت سے مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں (بعض صحابہ اور پیغمبر اکرم سے حدیث) نقل کی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ "جمیع اصحاب رسول الله فی الجنة محسنهم و مسیئهم" اس حدیث میں مذکورہ بالا آیت سے استناد کیا گیا ہے۔ (۲)

دلچسپ یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت کہتی ہے کہ تابعین اس صورت میں اہل نجات ہیں جب نیکیوں میں صحابہ کی پیروی کریں (نہ برائیوں میں) اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ صحابہ کے لیے بہشت کی ضمانت دی گئی ہے۔ کیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ گناہوں میں آزاد ہیں؟!

جو پیغمبرؐ لوگوں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے آیا ہے کیا ممکن ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو استثناء کر دے اور ان کے گناہوں سے چشم پوشی کرے۔ حالانکہ قرآن مجید، ازواج رسولؐ کے بارے میں فرماتا ہے کہ جو سب سے نزدیک صحابیہ تھیں، اگر تم نے گناہ کیا تو تمہاری سزا دو

۱) سورۂ توبہ آیت ۱۰۰۔
۲) تفسیر کبیر فخر رازی و تفسیر المنار ذیل آیت مذکورہ۔

برابر ہے۔(۱)

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اگر اس آیت میں کسی قسم کا ابہام بھی ہو تو اسے سورۂ فتح کی آیت نمبر ۲۹ رفع کر دیتی ہے کیونکہ یہ آیت پیغمبر اکرمؐ کے سچے اصحاب کی صفات بیان کر رہی ہے۔

"أشدّاء على الكفار رحماء بينهم تراهم ركعا سجدا يبتغون فضلا من الله و رضوانا سيماهم في وجوههم من أثر السجود"

یہ لوگ کفار کے مقابلے میں شدید اور زبردست ہیں اور آپس میں مہربان ہیں انہیں ہمیشہ رکوع و سجود کی حالت میں دیکھو گے اس حال میں کہ مسلسل فضل و رضائے خدا کو طلب کرتے ہیں۔ سجدہ کے آثار ان کے چہروں پر نمایاں ہیں"۔

جنہوں نے جمل و صفین جیسی جنگوں کی آگ بھڑکائی اور امام وقت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ہزاروں مسلمانوں کو قتل کرایا۔ کیا وہ ان سات صفات کے مصداق تھے؟ کیا وہ آپس میں مہربان تھے؟ کیا انکے عمل کی شدت کفار کے مقابلے میں تھی یا مسلمانوں کے مقابلے میں؟

اللہ تعالیٰ نے اسی آیت کے ذیل میں ایک جملہ ارشاد فرمایا ہے جو مقصود کو مزید روشن کرتا ہے

"وعد الله الذين آمنو و عملو الصالحات منهم مغفرة و أجرا عظيما"(۲)

اللہ تعالیٰ نے (ان اصحاب میں سے) جو ایمان لائے اور اعمال صالح انجام دیتے

۱) سورۂ احزاب آیہ ۳۰۔
۲) سورۂ فتح آیہ ۲۹۔

رہے ان سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ دیا ہے۔

پس واضح ہو گیا کہ مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو با ایمان اور اعمال صالح انجام دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے جنگ جمل میں مسلمانوں کو قتل کیا اور اس جیسی جنگوں کو بھڑکایا اور حضرت عثمان کے دور میں بیت المال کو ہڑپ کیا وہ کیا اعمال صالح انجام دینے والے تھے؟

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولوالعزم پیغمبروں کا ایک ترک اولیٰ کی خاطر مؤاخذہ کیا ہے۔ حضرت آدم کو ایک ترک اولیٰ کی خاطر بہشت سے نکال دیا۔ حضرت یونسؑ کو ایک ترک اولیٰ کی خاطر ایک عرصہ مچھلی کے پیٹ میں، تین اندھیروں میں بند رکھا۔ حضرت نوحؑ کو اپنے گناہ گار بیٹے کی سفارش پر تنبیہ فرمائی۔ تو اب کیا یہ یقین کرنے کی بات ہے کہ اصحاب پیغمبرؐ اس قانون سے مستثنیٰ ہوں۔

۶۔ کیا تمام اصحاب بغیر استثناء کے عادل تھے؟

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے اکثر برادران اہلسنت اسی بات کے قائل ہیں کہ تمام صحابہ یعنی جو پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں تھے یا جنہوں نے آپؐ کے زمانے کو پایا اور کچھ عرصہ تک آپؐ کے ساتھ رہے ہیں بغیر کسی استثناء کے مقام عدالت پر فائز تھے اور قرآن مجید اسی بات کی گواہی دیتا ہے۔

مقام افسوس یہ ہے کہ ان بھائیوں نے قرآن کی کچھ اُن آیات کو جو ان کے نفع میں تھیں قبول کر لیا ہے لیکن دوسری آیات سے انہوں نے چشم پوشی کی ہے اُن آیات سے جن میں اس

بات سے استثناء موجود ہے (جیسا کہ واضح ہے کہ ہر عموم کے لئے عام طور پر استثناء موجود ہوتا ہے)۔

ہم عرض کریں گے:

کہ یہ کیسی عدالت ہے جس کے خلاف قرآن مجید نے بارہا گواہی دی ہے۔ من جملہ سورۃ آل عمران کی آیت ۱۵۵ میں یوں بیان ہوا ہے۔

"انّ الذین تولّوا منکم یوم التقی الجمعان انّما استزلّھم الشیطان ببعض ما کسبوا و لقد عفا اللہ عنھم انّ اللہ غفورٌ حلیم"

اس آیت میں ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو جنگ اُحد کے دن فرار کر گئے اور پیغمبر اکرمؐ کو دشمن کے مقابلہ میں تنہا چھوڑ گئے تھے۔ آیت فرماتی ہے "جو لوگ دو لشکروں کے روبرو ہونے والے دن (یعنی جنگ احد میں) فرار کر گئے تھے۔ شیطان نے انہیں انکے بعض گناہوں کی وجہ سے بہکا لیا اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا چونکہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور بردبار ہے"۔

اس آیت سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اُس دن ایک گروہ فرار کر گیا تھا اور تاریخ میں اس گروہ کی تعداد بہت زیادہ ذکر کی گئی ہے اور دلچسپ یہ ہے کہ قرآن مجید کہتا ہے شیطان نے ان پر غلبہ کیا اور یہ غلبہ انکے اُن گناہوں کی وجہ سے تھا جس کے وہ پہلے مرتکب ہو چکے تھے۔ اس سے پتہ چلا کہ سابقہ گناہ ایک بڑے گناہ یعنی غزوہ سے فرار اور میدان اور دشمن سے پشت کر کے فرار کرنے کا موجب بنے۔ اگرچہ آیت کا ذیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بخش دیا۔

بخشش پروردگار پیغمبر اکرمؐ کی وجہ سے تھی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عادل تھے اور انہوں نے گناہ نہیں کیا۔ بلکہ صراحت کے ساتھ قرآن مجید فرما رہا ہے کہ انہوں نے متعدد گناہ کیے۔

یہ کیسی عدالت ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں سورۃ حجرات کی آیہ نمبر ۶ میں بعض کو فاسق کے عنوان سے یاد کر رہا ہے:

"یا ایھا الذین آمنو ان جاء کم فاسق بنبا فتبیّنوا ان تصیبوا قوما بجھالۃ فتصبحوا علیٰ ما فعلتم نادمین"

اے ایمان والو اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لے کر آئے تو اس کے بارے میں تحقیق کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ لاعلمی میں تم لوگ کسی کو نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر بعد میں اپنے کیے پر پشیمان ہو"

مفسرین کے درمیان مشہور ہے کہ یہ آیت "ولید بن عقبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے اسے ایک جماعت کے ساتھ "بنی المصطلق" قبیلہ کے پاس زکات کی جمع آوری کے لیے بھیجا۔ واپسی پر ولید نے کہا کہ وہ زکوٰۃ نہیں دیتے اور اسلام کے خلاف انہوں نے قیام کر لیا ہے مسلمانوں کے ایک گروہ نے ولید کی بات پر یقین کر لیا اور اس قبیلہ کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن سورۂ حجرات کی یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو خبردار کیا کہ "اگر ایک فاسق آدمی خبر لے کر آئے تو اس کے بارے میں تحقیق کر لیا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس جھوٹی خبر کی وجہ سے تم کسی قبیلہ کو نقصان پہنچاؤ اور پھر بعد میں [illegible]

پشیمان ہو۔

اتفاقاً تحقیق کے بعد واضح ہوا کہ بنی المصطلق قبیلہ کے لوگ مؤمن ہیں اور ولید کے استقبال کے لیئے باہر آئے تھے نہ اسلام اور اس کے خلاف قیام کرنے کے لیے لیکن چونکہ ولید انکے ساتھ سابقہ (قبل از اسلام) دشمنی رکھتا تھا اسی امر کا بہانہ بنا کر واپس چلا آیا اور غلط خبر پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں پیش کردی۔ ولید صحابی پیغمبر تھا۔ یعنی اُن افراد میں سے تھا جنہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کو پایا اور آپؐ کی خدمت میں رہے۔ جبکہ قرآن مجید اس آیت میں اُسے فاسق بتا رہا ہے۔ کیا یہ آیت تمام اصحاب کی عدالت والے نظریہ کے ساتھ سازگار ہے؟

یہ کیسی عدالت ہے کہ بعض اصحاب زکاۃ کی تقسیم کے وقت پیغمبر اکرمؐ پر اعتراض کرتے ہیں۔۔ قرآن مجید انکے اعتراض کو سورۂ توبہ آیہ ۵۸ میں نقل فرماتا ہے:

"ومنهم من یلمزک فی الصدقات فان أعطوا منها رضوا و ان لم یعطوا منها اذا هم یسخطون"

"انکے درمیان ایسے لوگ بھی ہیں جو غنائم کی تقسیم میں آپؐ پر اعتراض کرتے ہیں اگر انہیں اس میں سے عطا کیا جائے تو راضی ہیں اور اگر نہ دیا جائے تو غصے میں رہتے ہیں" کیا اس قسم کے افراد عادل ہیں؟

یہ کیسی عدالت ہے کہ قرآن مجید سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۱۲ اور ۱۳ میں جنگ احزاب کی منظر کشی کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ بعض منافقین اور بیمار دل لوگ جو پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں تھے اور انہوں نے جنگ میں شرکت کی لیکن پیغمبر اکرمؐ پر فریب کاری کی تہمت لگائی۔

"ما وعدنا الله و رسوله الا غرورا" خدا اور رسولؐ نے ہمیں صرف اور صرف جھوٹے وعدے دیئے ہیں! ان میں سے بعض یہ خیال رکھتے تھے کہ اس جنگ میں پیغمبر اکرمؐ کو شکست ہوگی اور احتمالاً وہ قتل ہوجائیں گے اور اسلام کی بساط لپٹ جائیگی۔

یا ان روایات کے مطابق جنہیں شیعہ و سنی نے نقل کیا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خندق کھودنے کے دوران ایک پتھر ملا جسے آپؐ نے توڑا اور مسلمانوں کو شام، ایران اور یمن کی فتح کا وعدہ دیا تو ایک گروہ نے آنحضرتؐ کی اس بات کا مذاق اڑایا۔

کیا یہ اصحاب نہیں تھے؟ اور اس سے زیادہ عجیب بات کو بعد والی آیت بیان کر رہی ہے کہ "ان میں سے ایک گروہ نے (مدینہ کے بعض لوگوں کو کہ جو جنگ میں حاضر ہوئے تھے مخاطب کرکے) کہا یہ تمہارے ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے اپنے گھروں کو واپس چلے جاؤ "و اذ قالت طائفة منهم یا اهل یثرب لا مقام لکم فارجعوا"

اور پھر ایک گروہ آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا اور میدان احزاب سے فرار کرنے کے بہانے بنانے لگا۔ اسی آیت میں یوں ارشاد ہے "و یستاذن فریق منهم النبی یقولون ان بیوتنا عورة و ما هی بعورة ان یریدون الا فرارا" ان میں سے ایک گروہ پیغمبر اکرمؐ سے واپسی کی اجازت مانگتا تھا اور کہتا تھا کہ ہمارے گھر اکیلے ہیں لہٰذا ہمیں اجازت دیجئے تاکہ اپنے گھروں کی حفاظت کے لیے واپس مدینہ چلے جائیں۔ یہ لوگ جھوٹ بول رہے تھے ان کے گھر اکیلے نہیں تھے۔ یہ صرف فرار کا بہانہ تلاش کر رہے تھے" اب خود ہی فیصلہ کیجئے ہم کیسے ان تمام امور سے چشم پوشی کرلیں اور ان پر تنقید کو جائز نہ سمجھیں؟

ان سب سے بدتر بعض اصحاب کا پیغمبر اکرمؐ کی طرف خیانت کی نسبت دینا ہے اور قرآن مجید نے سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۱ میں اسے منعکس کیا ہے "وَ ما کانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَغُلَّ وَ مَنْ یَغْلُلْ یَاْتِ بِما غَلَّ یَوْمَ الْقِیامَةِ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ ما کَسَبَتْ وَ هُمْ لا یُظْلَمُونَ"

"ممکن نہیں ہے کہ کوئی نبی خیانت کرے اور جو کوئی خیانت کرے گا قیامت کے دن جس قسم کی خیانت کی ہوگی اسے اپنے ساتھ دیکھے گا۔ پھر ہر ایک کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائیگا۔ اور کسی پر ظلم نہیں کیا جائیگا" یعنی اگر سزا ملے گی تو انکے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوگی۔

اس آیت کی دو شان نزول بیان کی گئی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت "عبداللہ بن جُبیر" کے دوستوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ وہ جنگ اُحد میں "عینین" نامی مورچہ میں تھے۔ اور جب جنگ کی ابتداء میں اسلام کا لشکر دشمن پر فتح پا گیا تو عبداللہ کے ہمراہ تیرانداز تھے حالانکہ رسولخداؐ نے فرمایا تھا کہ تمہیں اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرنی جبکہ اس گروہ نے اپنا مورچہ چھوڑ دیا اور غنائم لوٹنے کے پیچھے دوڑ پڑے۔ اس سے بھی بدتر عمل انکی باتیں تھیں کہ کہتے تھے کہ ہمیں خطرہ ہے کہیں رسولخداؐ ہمارا حق ہمیں نہ دیں (اور اس قسم کے جملے کہے جنہیں لکھنے سے قلم شرم محسوس کرتی ہے)۔

"ابن کثیر" اور "طبری" نے اسی آیت کے ذیل میں اپنی تفسیر میں ایک اور شان نزول کو ذکر کیا ہے۔ وہ یہ کہ جنگ بدر میں کامیابی کے بعد ایک سرخ رنگ کا قیمتی کپڑا گم ہو گیا۔ بعض کم عقل لوگوں نے رسولخداؐ کو خیانت سے متہم کیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کپڑا مل گیا اور معلوم ہوا کہ لشکر میں موجود فلاں شخص نے اٹھایا تھا۔

پیغمبر اکرمؐ کی طرف اس قسم کی ناروا نسبتیں دینے کے باوجود کیا عدالت باقی رہتی ہے؟ اگر ہم اپنے وجدان کے ساتھ قضاوت کریں تو کیا قبول کریں گے کہ اس قسم کے افراد عادل اور پاک و پاکیزہ تھے اور کسی کو انکے ایسے کاموں پر تنقید کرنے کا حق نہیں ہے؟

ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کے اکثر اصحاب و یاران باتقوٰی اور پاکیزہ انسان تھے۔ لیکن سب کے لیے ایک ہی حکم لگا دینا اور سب پر تقوٰی اور عدالت کی قلعی چڑھا دینا اور ان پر کسی قسم کی تنقید کرنے کا حق سلب کر دینا ایک انتہائی عجیب بات ہے۔

یہ کیسی عدالت ہے کہ ایک انسان جو ظاہراً پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب میں سے ہے (ہمارا مقصود معاویہ ہے) نبی اکرمؐ کے باعظمت صحابی حضرت علیؑ پر سالہا سال سبّ و لعن کرتا ہے اور تمام شہروں میں سب کو اس کام کا حکم دیتا ہے۔

ان دو احادیث کی طرف توجہ فرمائیے:

ا۔ صحیح مسلم میں کہ جو اہلسنت کی معتبر ترین کتاب ہے یوں بیان ہوا ہے۔

کہ "معاویہ" نے "سعد بن ابی وقاص" سے کہا کہ کیوں ابوتراب (علی ابن ابی طالب) پر سبّ و لعن سے پرہیز کرتے ہو؟ اس نے کہا میں نے پیغمبر اکرمؐ سے اُن کے بارے میں تین فضائل ایسے سنے ہیں کہ اگر وہ میرے بارے میں ہوتے تو میرے لیئے دنیا کی عظیم دولت سے زیادہ اہمیت رکھتے۔ اس لیے میں اُن پر سبّ و شتم نہیں کرتا ہوں۔ (۱)

۱) صحیح مسلم، جلد ۴ ص ۱۸۷۱، کتاب فضائل الصحابہ اور اسی طرح کتاب فتح الباری فی شرح صحیح البخاری، جلد ۷ ص ۶۰ پر بھی یہ حدیث بیان ہوئی ہے (وہ تین فضلیتیں یہ ہیں: ۱۔ حدیث منزلت ۲۔ ... ۳۔ ... مباہلہ)۔

۲۔ کتاب "العقد الفرید" میں کہ جسے اہلسنت کے بزرگ عالم دین (ابن عبد ربہ اندلسی) نے تالیف کیا ہے یوں بیان ہوا ہے کہ جب امام حسن ابن علی علیہما السلام کی شہادت ہوئی، اس کے بعد معاویہ مکہ کے بعد مدینہ آیا اُس کا ارادہ تھا کہ مدینہ میں منبر رسولؐ سے حضرت علی علیہ السلام پر سب و لعن کرے۔ لوگوں نے کہا کہ "سعد بن ابی وقاص" بھی مسجد میں ہے اور ہمارے خیال کے مطابق وہ تیری اس بات کو تحمل نہیں کریگا اور شدید ردّعمل کا اظہار کرے گا لہذا کسی کو اُس کے پاس بھیج کر اُس کی نظر معلوم کرلو۔

معاویہ نے ایک آدمی کو سعد کے پاس بھیجا اور اس مطلب کے بارے میں استفسار کیا سعد نے جواب میں کہا کہ اگر معاویہ نے یہ کام کیا تو میں رسولخداؐ کی مسجد سے باہر چلا جاؤں گا اور پھر کبھی مسجد نبوی میں داخل نہیں ہوں گا۔

معاویہ نے یہ پیغام اور ردّعمل سُننے کے بعد سب و شتم سے پرہیز کیا۔ یہاں تک کہ سعد فوت ہوگئے۔ سعد کی وفات کے بعد معاویہ نے منبر سے حضرت علیؑ پر لعنت کی اور اپنے تمام اہلکاروں کو حکم دیا کہ منبروں سے حضرت پر لعن و سب کریں۔ اُن سب نے بھی یہی کام کیا۔ اس بات کا جب جناب ام سلمہ زوجہ پیغمبرؐ کو پتہ چلا تو انہوں نے معاویہ کے نام ایک خط میں یوں لکھا کہ "تم کیوں منبروں سے خدا اور رسولؐ پر سب و لعن کرتے ہو! کیا تم یوں نہیں کہتے ہو کہ علیؑ اور اسکے چاہنے والوں اور محبت کرنیوالوں پر لعنت، میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ حضرت علیؑ سے محبت کرتا ہے اور رسولخداؐ بھی حضرت علیؑ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ پس حقیقت میں تم خدا اور رسولخداؐ پر سب و لعن کرتے ہو" معاویہ نے جناب ام سلمہ کا خط پڑھا لیکن اس کی کوئی پرواہ نہ کی (۱)

(۱) العقد الفرید، جلد ۴ ص ۳۶۶ و جواہر المطالب فی مناقب الامام علی ابن ابی طالب، جلد ۲ ص ۲۲۸ تالیف محمد بن احمد الدمشقی الشافعی، متوفائے قرن نہم ہجری قمری۔

کیا اس قسم کے بُرے کام عدالت کے ساتھ سازگار ہیں؟ کیا کوئی عاقل یا عادل انسان یہ جرأت کرسکتا ہے کہ حضرت علیؑ جیسی با عظمت شخصیت کو اس شرمناک انداز اور اتنے وسیع پیمانے پر گالیاں دے۔

ایک عرب شاعر یوں کہتا ہے:

اعلی المنابر تعلنون بسبّہ و بسیفہ نصبت لکم اعوادھا؟!

کیا منبر سے اس شخصیت پر لعن کرتے ہو جس کی تلوار کی برکت سے یہ منبر قائم ہوئے ہیں۔

۷۔ اصحاب پیغمبرؐ کی اقسام:

رسولخداؐ کے اصحاب کو۔ قرآن مجید کی گواہی کے مطابق۔ پانچ اصلی گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ پاک و صالح: یہ افراد مؤمن اور با اخلاص تھے۔ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نفوذ کرچکا تھا۔ یہ لوگ راہ خدا میں اور کلمۂ اسلام کی بلندی کے لیے کسی قسم کے ایثار اور قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ یہ وہی گروہ ہے جس کی طرف سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۱۰۰ میں اشارہ ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی تھا اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کے الطاف پر راضی تھے۔ "رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ"

۲۔ مؤمن خطاکار: یہ وہ گروہ ہے جو ایمان اور عمل صالح رکھنے کے باوجود کبھی کبھار لغزش کا شکار ہوجاتے تھے اور اعمال صالح اور غیر صالح کو آپس میں مخلوط کردیتے تھے۔ اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے تھے۔ ان کے عفو و بخشش کی امید ہے جیسا کہ سورۂ توبہ

کی آیہ ۱۰۲ میں پہلے گروہ کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس گروہ کا تذکرہ کیا ہے۔

"و آخرون اعترفوا بذنوبھم خلطوا عملاً صالحاً و آخر سیّأ عسی اللہ ان یتوب علیھم"

۳۔ گناہگار افراد: یہ وہ گروہ ہے جس کے لیے قرآن مجید نے فاسق کا نام انتخاب کیا ہے۔ کہ اگر فاسق تمہارے لیے خبر لائے تو بغیر تحقیق کے قبول نہ کرنا۔ سورہ حجرات کی آیت نمبر ۶ میں اس مطلب کی طرف اشارہ ہوا ہے: "یا ایھا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنباء فتبینوا" اس آیت کا مصداق شیعہ وسنی تفاسیر میں ذکر کیا گیا ہے۔

۴۔ ظاہری مسلمان: یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام کا دعویٰ کرتے تھے لیکن ایمان ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا تھا۔ سورہ حجرات کی چودھویں آیت میں اس گروہ کی طرف اشارہ ہوا ہے "قال الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا و لکن قولوا اسلمنا و لما یدخل الایمان فی قلوبکم"

۵۔ منافقین: یہ وہ گروہ ہے جو روح نفاق کے ساتھ مسلمانوں کے درمیان چھپے ہوئے تھے کبھی ان کی شناخت ہو جاتی اور کبھی نہ ہوتی تھی۔ یہ لوگ اسلام اور مسلمین کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکانے سے باز نہیں رہتے تھے۔ سورہ توبہ میں ہی مؤمن وصالح گروہ کی طرف اشارہ کے بعد آیت ۱۰۱ میں ان منافقین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

"و ممن حولکم من الاعراب منافقون و من اھل المدینۃ مردوا علی النفاق" بے شک ان تمام گروہوں نے پیغمبر اکرمؐ کا دیدار کیا تھا اور آنحضرتؐ کے ساتھ مصاحبت اور معاشرت رکھتے تھے۔ اور ان میں سے بہت ساروں نے غزووں میں شرکت کی

تھی۔ اور ہم صحابہ کی جو تعریف بھی کریں ان پانچوں گروہوں پر صادق آتی ہے کیا سب کو اہل بہشت اور پاکیزہ شمار کیا جا سکتا ہے؟ کیا قرآن مجید کی صراحت کے بعد یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم راہ اعتدال کو اپنائیں اور اصحاب کو قرآن مجید میں بیان شدہ پانچ گروہوں میں تقسیم کریں اور ان میں سے نیک و باتقویٰ اصحاب کے لیے انتہائی احترام کے قائل ہوں اور دیگر گروہوں میں سے ہر ایک کو انکے مقام پر رکھیں۔ اور غلو، افراط اور تعصب سے پرہیز کریں۔ (اور انصاف کے ساتھ قضاوت کریں)

۸۔ تاریخی گواہی: تمام اصحاب کی قداست کے عقیدے نے اس کے طرفداروں کے لئے بہت سی مشکلات ایجاد کی ہیں۔ ان عظیم مشکلات میں سے ایک تاریخی حقائق ہیں۔ کیونکہ انکی معروف اور مورد اعتماد تاریخی کتب میں حتی صحاح ستہ کی احادیث میں بعض صحابہ کی شدید لڑائی اور جنگ کے تذکرے ہیں ایسی صورتحال میں ہم فریقین کو عادل، صالح اور مقدس شمار نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ یہ کام ضدین کے درمیان جمع کرنا ہے اور ضدین کے درمیان جمع نہ ہو سکنا ایک واضح عقلی فیصلہ ہے جس کا انکار ممکن نہیں ہے۔

جنگ جمل اور صفین کے علاوہ کہ جو طلحہ، زبیر اور معاویہ نے امام المسلمین حضرت علی علیہ السلام کے مقابلہ میں لڑیں اگر ہم حقائق سے چشم پوشی نہ کریں تو حتماً جنگ بھڑکانے والوں کی غلطیوں اور جنایتوں کا اعتراف کریں گے۔ اور اس سلسلہ میں بہت سے تاریخی شواہد موجود ہیں۔ اس مختصر کتاب میں ہم صرف تین نمونوں پر اکتفا کریں گے۔

۱۔ امام بخاری اپنی کتاب صحیح میں کتاب التفسیر میں مسئلہ افک کے بارے میں (زوجۂ پیغمبرؐ کے بارے میں جو تہمت لگائی گئی تھی) لکھتے ہیں: کہ ایک دن پیغمبر اکرمؐ منبر پر تشریف

لے گئے اور فرمایا اے مسلمانوں! کون اس شخص کو سزا دے گا (مقصود عبداللہ بن سلول تھا جو منافقین کا ایک سرغنہ تھا) مجھے بتایا گیا ہے کہ اس نے میری بیوی پر تہمت لگائی ہے حالانکہ میں نے اپنی بیوی میں کوئی ایسی بات نہیں دیکھی...... سعد بن معاذ انصاری (مشہور صحابی) اٹھ کھڑے ہوئے اور عرض کی، میں اس کو سزا دوں گا اگر یہ "اوس" قبیلہ سے ہوا تو میں اس کی گردن اڑا دونگا اور اگر یہ خزرج قبیلہ سے ہوا تو جو حکم آپ صادر فرمائیں گے ہم انجام دیں گے۔ سعد بن عبادہ، خزرج قبیلہ کا سردار کہ جو اس سے پہلے صالح آدمی تھا قبائلی تعصب کی وجہ سے سعد بن معاذ کو کہنے لگا خدا کی قسم تو جھوٹ بول رہا ہے تیری اتنی جرأت نہیں ہے کہ تو یہ کام کر سکے اسید بن حضیر (سعد بن معاذ کا چچا زاد) کہنے لگا کہ خدا کی قسم تو جھوٹا ہے یہ شخص منافقین میں سے ہے ہم اسے ضرور قتل کریں گے۔ نزدیک تھا کہ قبیلہ اوس و خزرج کی آپس میں جنگ چھڑ جائے۔ رسولخداؐ نے انہیں خاموش کرایا (۱) کیا یہ سب افراد صالح صحابی تھے؟

۲: معروف دانشمند "بلاذری" اپنی کتاب "الانساب" میں لکھتے ہیں کہ "سعد بن ابی وقاص" کوفہ کے والی تھے، حضرت عثمان نے انہیں معزول کر دیا اور "ولید بن عقبہ" کو انکی جگہ گورنر بنا دیا۔ عبداللہ بن مسعود اس دوران بیت المال کے خزانہ دار تھے جب ولید، کوفہ میں داخل ہوا تو اس نے عبداللہ ابن مسعود سے بیت المال کی چابیاں طلب کیں۔ عبداللہ نے چابیاں ولید کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا کہ خلیفہ نے سنتِ (رسولؐ) کو تبدیل کر دیا ہے۔ سعد بن ابی وقاص جیسے آدمی کو معزول کر کے ولید جیسے آدمی کو اپنا جانشین منتخب کر لیا ہے؟ ولید نے حضرت عثمان کو خط میں لکھا کہ عبداللہ بن مسعود آپ پر تنقید کرتا ہے خلیفہ نے جواب لکھا

---

۱) صحیح بخاری، جلد ۵ ص ۵۷۔

کہ اسے حکومت کی نگرانی میں میرے پاس بھیج دیا جائے۔ جب عبداللہ بن مسعود مدینہ میں وارد ہوا تو خلیفہ منبر پر تھے جیسے ہی انکی نظر عبداللہ بن مسعود پر پڑی تو کہنے لگے بُرا جانور داخل ہو گیا ہے! (اور بہت سی گالیاں دیں قلم جنہیں لکھنے سے شرم محسوس کرتا ہے) عبداللہ بن مسعود کہنے لگے میں ایسا نہیں ہوں، میں رسولخداؐ کا صحابی ہوں۔ جنگ بدر اور بیعت رضوان میں شریک تھا۔

حضرت عائشہ، عبداللہ کی حمایت کے لیے اٹھیں لیکن حضرت عثمان کا غلام، عبداللہ کو مسجد سے باہر لے گیا اور انہیں زمین پر پٹخا اور انکی پسلیاں توڑ دیں (۱)

۳: بلاذری اپنی اسی کتاب انساب الاشراف میں نقل کرتے ہیں کہ مدینہ کے بیت المال میں بعض جواہرات اور زیورات تھے حضرت عثمان نے ان میں سے کچھ زیورات اپنے گھر والوں کو بخش دیئے۔ جب لوگوں نے دیکھا تو کھلے عام اعتراض شروع کر دیا اور انکے بارے میں سخت وگھٹیا باتیں کہیں حضرت عثمان کو غصہ آ گیا اور وہ منبر پر گئے اور خطبہ کے دوران کہا ہم غنائم میں سے اپنی ضرورت کے مطابق اٹھائیں گے! اگرچہ لوگوں کی ناک زمین پر رگڑی جائے!!

اس پر حضرت علی علیہ السلام نے کہا کہ "مسلمان خود تمہارا راستہ روک لیں گے"!

جناب عمار یاسر نے کہا سب سے پہلے میری ناک زمین پر رگڑی جائے گی!

(اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ میں تنقید سے باز نہیں آؤنگا)

حضرت عثمان کو غصہ آ گیا اور کہنے لگے تو نے میری شان میں گستاخی کی ہے۔ اس کو گرفتار

---

۱) انساب الاشراف، جلد ۶ ص ۱۴۷، تاریخ ابن کثیر، جلد ۷ ص ۱۶۳ و ۱۸۳ ... (خلاصہ)

کرلو۔ لوگوں نے جناب عمار کو پکڑ لیا اور عثمان کے گھر لے گئے وہاں انہیں اسقدر مارا گیا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ اس کے بعد انہیں جناب ام سلمہ (زوجہ پیغمبرؐ) کے گھر لایا گیا وہ اس وقت بے ہوشی کے عالم میں تھے یہاں تک کہ انکی ظہر، عصر اور مغرب کی نماز قضاء ہو گئی۔ جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے وضو کر کے نماز ادا کی اور کہنے لگے یہ پہلی بار نہیں ہے کہ ہمیں خدا کی خاطر اذیت و آزار پہنچائی جا رہی ہے۔(۱) (ان واقعات کی طرف اشارہ تھا جنکا زمانہ جاہلیت میں کفار کیطرف سے انہیں سامنا کرنا پڑا تھا)۔

ہم ہرگز مائل نہیں ہیں کہ تاریخ اسلام کے اس قسم کے ناگوار حوادث کو نقل کریں ([illegible] آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است!) اگر ہمارے بھائی تمام صحابہ اور انکے تمام کاموں کے تقدس پر اصرار نہ کرتے تو شاید اتنی مقدار کے نقل کرنے میں بھی مصلحت نہیں تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ اصحاب رسولؐ میں سے تین پاکیزہ ترین افراد (سعد بن معاذ، عبداللہ ابن مسعود اور عمار یاسر) کو گالیاں دینے اور مارنے پیٹنے کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟ ایک باعظمت صحابی کو اتنا مارا جائے کہ اسکی پسلیاں ٹوٹ جائیں اور دوسرے کو اتنا مارا جائے کہ بے ہوش ہو جائے اور اس کی نمازیں قضا ہو جائیں۔

کیا یہ تاریخی شواہد کہ جنکے نمونے بہت زیادہ ہیں ہمیں اجازت دیتے ہیں کہ ہم حقائق سے چشم پوشی کریں اور کہیں کہ تمام اصحاب اچھے اور انکے تمام کام صحیح تھے۔ اور ایک ”بت“ صحابہؓ کے نام سے بنا دیں اور انکے تمام کاموں کا بلا شروط دفاع کریں۔

کیا کوئی بھی عقلمند اس قسم کے افکار کو پسند کرتا ہے؟

---

۱) انساب الاشراف جلد ۶ ص ۱۶۱۔

اس مقام پر پھر تکرار کرتے ہیں کہ رسولخداؐ کے اصحاب میں مومن، صالح اور پارسا افراد بہت سے تھے لیکن کچھ ایسے افراد بھی تھے جنکے کاموں پر تنقید کرنا چاہیے اور انکی تحلیل کرتے ہوئے انہیں عقل کے ترازو پر تولنا چاہیے اور اس کے بعد انکے بارے میں حکم لگانا چاہیے۔

۹۔ پیغمبرؐ کے زمانے میں یا اس کے بعد بعض صحابہ پر حدّ کا جاری ہونا!

صحاح ستہ یا برادران اہلسنت کی دیگر معروف کتابوں میں کچھ موارد ایسے دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں بعض اصحاب، رسولخداؐ کے زمانے میں یا اس کے بعد ایسے گناہوں کے مرتکب ہوئے جن کی حد وسزا تھی۔ لہٰذا اُن پر حد جاری کی گئی۔

کیا اس کے باوجود آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب عادل تھے؟ اور ان سے کوئی غلطی نہیں ہوئی؟ یہ کیسی عدالت ہے کہ ایسا گناہ کیا جائے جس پر حد جاری ہوتی ہو اور ان پر حد جاری ہونے کے بعد بھی عدالت اپنی جگہ محکم باقی رہتی ہے؟

ہم ذیل میں نمونہ کے طور پر چند موارد کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

الف) ”نعیمان“ صحابی نے شراب پی، پیغمبر اکرمؐ نے حکم صادر فرمایا اور اسے تازیانے مارے گئے(۱)

ب) ”بنی اسلم“ قبیلہ کے ایک مرد نے زنائے محصن کیا تھا۔ پیغمبر اکرمؐ کے حکم پر اسے سنگسار کر دیا گیا(۲)

---

۱) صحیح بخاری، جلد ۸، ص ۱۳، حدیث نمبر ۶۷۷۵، کتاب الحدود۔
۲) صحیح بخاری، جلد ۸، ص ۲۲، حدیث ۶۸۲۰۔

ج) واقعۂ افک میں پیغمبر اکرمؐ کے حکم پر چند افراد پر حدِ قذف جاری کی گئی تھی (۱)

د) پیغمبر اکرمؐ کے بعد عبدالرحمن بن عمر اور عقبہ بن حارث بدری نے شراب پی اور مصر کے امیر عمرو ابن عاص نے ان پر حدِ شرعی جاری کی۔ اس کے بعد عمر نے دوبارہ اپنے بیٹے کو بلایا اور دوبارہ اس پر حد جاری کی (۲)

ہ) ولید بن عقبہ کا واقعہ مشہور ہے کہ اس نے شراب پی اور مستی کے عالم میں صبح کی نماز چار رکعت پڑھادی۔ اُسے مدینہ حاضر کر کے شراب کی حد اس پر جاری کی گئی۔ (۳)

ان کے علاوہ اور بہت سے موارد ہیں، مصلحت کی خاطر جن کے ذکر سے اجتناب کیا جارہا ہے۔ اس کے باوجود کیا اب بھی ہم حقائق کے سامنے آنکھیں اور کان بند کرلیں اور کہہ دیں کہ سب اصحاب عادل تھے؟!

۱۰۔ نادرست توجیہات

۱۔ تنزیہ اور ہر لحاظ سے تقدس کے نظریہ کے طرفدار جب متضاد حالات کے انبوہ سے روبرو ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو اس توجیہ کے ساتھ قانع کرتے ہیں کہ سب صحابہ "مجتہد" تھے اور ہر ایک نے اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کیا۔ یقیناً یہ تو ضمیر اور وجدان کو فریب دینا ہے کہ برادران اس قسم کے آشکار اختلافات میں اس بوگس توجیہ کا سہارا لیں۔

---

۱) المعجم الکبیر، جلد ۲۳، ص ۱۲۸ اور کتب دیگر۔
۲) السنن الکبریٰ، جلد ۸، ص ۳۱۲ اور بہت سی کتب۔
۳) صحیح مسلم، جلد ۵، ص ۱۲۶، حدیث نمبر ۱۷۰۷۔

کیا بیت المال کو ہڑپ کرنے کے بارے میں ایک معمولی سی تنقید اور سادہ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مقابلے میں ایک مؤمن صحابی کو اتنا مارنا کہ وہ بے ہوش اور اس کی نمازیں قضا ہوجائیں، اجتہاد ہے؟ کیا ایک اور مشہور صحابی کی پسلیاں توڑ دینا صرف اس اعتراض کی خاطر جو اس نے کیا کہ کیوں ایک شرابی (ولید) کو کوفہ کا حاکم تعیین کیا گیا ہے، اجتہاد شمار ہوتا ہے؟

اس سے بڑھ کر امام المسلمین کے مقابلے میں کہ جو مقامات الٰہی کے ساتھ ساتھ تمام مسلمانوں کے منتخب کردہ اتفاقی خلیفہ تھے، صرف جاہ طلبی اور حکومت حاصل کرنے کی خاطر جنگ کی آگ بھڑکانا جس میں ہزاروں مسلمانوں کا خون بہہ جائے، اجتہاد شمار ہوتا ہے؟

اگر یہ موارد اور ان کی مثل، اجتہاد کی شاخیں شمار ہوتی ہیں تو پھر طول تاریخ میں ہونے والی تمام جنایات کی یہی توجیہ کی جاسکتی ہے۔

اس کے علاوہ کیا اجتہاد صرف اصحاب میں منحصر تھا یا کم از کم چند صدیوں بعد بھی امت اسلامی میں کثرت کے ساتھ مجتہد موجود تھے بلکہ بعض علمائے اہلسنت کے اعتراف اور تمام علمائے شیعہ کے مطابق آج بھی تمام آگاہ علماء کے لئے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے؟

جو افراد اس قسم کے بھیانک افعال انجام دیں کیا آپ انکے افعال کی توجیہ کرنے کو حاضر ہیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔

۲۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ انکے بارے میں سکوت اختیار کریں۔

"تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت و لکم ما کسبتم و لا تسئلون عما کانوا یعملون" (۱)

---

۱) سورۂ بقرہ آیت ۱۳۴۔

وہ ایک امت ہیں جو گزر چکے انکے اعمال انکے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ اور آپ سے انکے اعمال کے بارے میں نہیں پوچھا جائیگا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ ہماری سرنوشت میں مؤثر نہ ہوتے تو پھر یہ بات اچھی تھی۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کی روایات کو انکے توسط سے دریافت کریں اور انہیں اپنے لیے نمونۂ عمل قرار دیں۔ تو کیا اس وقت یہ ہمارا حق نہیں ہے کہ ثقہ اور غیر ثقہ اسی طرح عادل اور فاسق کی شناخت کریں تاکہ اس آیت "إن جاء كم فاسق بنباءٍ فَتَبَيَّنُوا" اگر فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تحقیق کیجئے"(۱) پر عمل کر سکیں۔

۱۱۔ مظلومیت علیؑ

جو بھی تاریخ اسلام کا مطالعہ کرے اس نکتہ کو با آسانی درک کر سکتا ہے کہ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ حضرت علی علیہ السلام جو علم و تقویٰ کا پہاڑ، پیغمبر اکرمؐ کے نزدیک ترین ساتھی اور اسلام کے سب سے بڑے مدافع تھے، انہیں اسطرح ہتکِ حرمت، توہین اور سب و شتم کا نشانہ بنایا گیا۔

انکے دوستوں کو اسطرح دردناک اذیتوں اور مظالم سے دوچار کیا گیا کہ تاریخ میں انکی نظیر نہیں ملتی۔ وہ بھی ان افراد کیطرف سے جو اپنے آپ کو پیغمبر اکرمؐ کا صحابی شمار کرتے ہیں۔

چند نمونے ملاحظہ فرمایئے:

الف) لوگوں نے علی ابن جہم خراسانی کو دیکھا کہ اپنے باپ پر لعنت کر رہا ہے جب وجہ

۱) سورۂ حجرات آیۃ ۶۔

پوچھی گئی تو کہنے لگا: اس لیے لعنت کر رہا ہوں کیونکہ اس نے میرا نام علی رکھا ہے۔(۱)

ب) معاویہ نے اپنے تمام کارندوں کو آئین نامہ میں لکھا: جس نے بھی ابوتراب (علی علیہ السلام) اور انکے خاندان کی کوئی فضیلت نقل کی وہ ہماری امان سے خارج ہے (اس کی جان و مال مباح ہے) اس آئین نامہ کے بعد سب خطباء پوری مملکت میں منبر سے علی الاعلان حضرت علی پر سب و شتم کرتے اور اُن سے اظہار بیزاری کرتے تھے۔ اس طرح ناروا نسبتیں انکی اور انکے خاندان کی طرف دیتے تھے۔(۲)

ج) بنوامیہ جب بھی سنتے کہ کسی نومولود کا نام علی رکھا گیا ہے اسے فوراً قتل کر دیتے۔ یہ بات سلمۃ بن شعیب نے ابوعبدالرحمن عقری سے نقل کی ہے۔(۳)

د) زمخشری اور سیوطی نقل کرتے ہیں کہ بنوامیہ کے دور حکومت میں ستر ہزار سے زیادہ منابر سے سب علی کیا جاتا تھا اور یہ بدعت معاویہ نے ایجاد کی تھی۔(۴)

ہ) جس وقت عمر بن عبدالعزیز نے حکم دیا کہ اس بُری بدعت کو ختم کیا جائے اور نماز جمعہ کے خطبوں میں امیر المؤمنین علی علیہ السلام کو بُرا بھلا نہ کہا جائے تو مسجد سے نالہ و فریاد بلند ہوگئی اور سب عمر بن عبدالعزیز کو کہنے لگے "ترکتَ السُّنّة ترکتَ السُّنّة" تو نے سنت کو ترک کر دیا ہے۔ تو نے سنت کو ترک کر دیا ہے۔(۵)

۱) لسان المیزان جلد۴ ص۲۱۰۔
۲) النصائح الکافیہ ص۷۲۔
۳) تہذیب الکمال جلد۲۰ ص۳۲۹ اور سیر اعلام النبلاء جلد۵ ص۱۰۲۔
۴) ربیع الابرار جلد۲ ص۱۸۶ اور النصائح الکافیہ ص۹۷ عن السیوطی۔
۵) النصائح الکافیہ ص۱۱۶ اور تناقضات الصدیق المکروب ... سقاف ص۵۹

یہ سب اس صورت میں ہے کہ برادران اہلسنت کی معتبر اور صحیح کتب کی روایت کے مطابق پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ "من سبّ علیاً فقد سبّنی و من سبّنی فقد سبّ اللہ" جس نے علیؑ کو گالی دی اس نے مجھے گالی دی اور جس نے مجھے گالی دی اس نے خدا کو گالی دی!!"(۱)

۱۲: ایک دلچسپ داستان

حُسنِ اختتام کے طور پر شاید اس واقعہ کو نقل کرنے میں کوئی مضائقہ نہ ہو کہ جو خود ہمارے ساتھ مسجد الحرام میں پیش آیا ہے۔

ایک دفعہ جب عمرہ پر جانے کا اتفاق ہوا تو ایک رات ہم مغرب و عشاء کی نماز کے درمیان مسجد الحرام میں بیٹھے تھے کہ کچھ علماء حجاز کے ساتھ تمام اصحاب کے تقدس کے بارے میں ہماری بحث شروع ہوگئی، وہ معمول کے مطابق اعتقاد رکھتے تھے کہ اصحاب پر معمولی سی بھی تنقید نہیں کرنا چاہیے۔یا یوں کہہ دیجئے کہ پھول سے زیادہ نازک اعتراض بھی ان پر نہیں کرنا چاہئے۔ہم نے اُن کے ایک عالم کو مخاطب کر کے کہا: آپ فرض کیجیے کہ اس وقت" جنگ صفین" کا میدان گرم ہے۔آپ دو صفوں میں سے کس کا انتخاب کریں گے؟ صفِ علیؑ کا! صفِ معاویہ کا؟

کہنے لگے: یقیناً صفِ علیؑ کا انتخاب کروں گا۔

میں نے کہا: اگر حضرت علیؑ آپ کو حکم دیں کہ یہ تلوار لے کر معاویہ کو قتل کر دیں تو آپ کیا کریں گے؟

۱) اخرجه الحاکم و صححه و اقره الذهبی (مستدرک الصحیحین، جلد۳، ص۱۲۱)۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگے کہ معاویہ کو قتل کردوں گا لیکن اس پر کبھی بھی تنقید نہیں کرونگا!!

ہاں یہ ہے غیر منطقی عقائد پر اصرار کرنے کا نتیجہ کہ اس وقت دفاع بھی غیر منطقی ہوتا ہے اور انسان سنگلاخ میں پھنس جاتا ہے۔

حق یہ ہے کہ یوں کہیں: قرآن مجید اور تاریخ اسلام کی شہادت کے مطابق، اصحاب پیغمبر اکرمؐ ایک تقسیم کے مطابق چند گروہوں پر مشتمل تھے۔اصحاب کا ایک گروہ ایسا تھا جو شروع میں پاک، صادق اور صالح تھا اور آخر تک وہ اپنے تقویٰ پر ثابت قدم رہے۔"عاشُوا سعداء و ماتوا السعداء" انہوں نے سعادت کی زندگی گذاری اور سعادت کی موت پائی۔

ایک گروہ ایسا تھا جو آنحضرت کی زندگی میں تو صالح اور پاک افراد کی صف میں تھے لیکن بعد میں انہوں نے جاہ طلبی اور حب دنیا کی خاطر اپنا راستہ تبدیل کر لیا تھا۔اور ان کا خاتمہ خیر و سعادت پر نہیں ہوا (جیسے جمل وصفین کی آگ بھڑکانے والے)

اور تیسرا گروہ شروع سے ہی منافقوں اور دنیا پرستوں کی صف میں تھا۔اپنے خاص مقاصد کی خاطر وہ مسلمانوں کی صفوں میں گھسے ہوئے تھے جیسے ابوسفیان وغیرہ یہاں پر پہلے گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہم یوں کہیں گے۔

"ربّنا اغفر لنا و لاخواننا الذین سبقونا بالایمان و لا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربّنا انک رءوف رّحیم"(۱)

۱) سورۂ حشر آیت ۱۰۔

٤

بزرگوں کی قبروں کا احترام

اجمالی خاکہ

اس مسئلہ میں ہمارے مخاطب صرف شدت پسند وہابی ہیں۔ کیونکہ اسلام کے بزرگوں کی قبور کی زیارت کو مسلمانوں کے تمام فرقے (سوائے اس چھوٹے سے گروہ کے) جائز سمجھتے ہیں۔

بہرحال بعض وہابی ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ تم کیوں مذہبی رہنماؤں کی زیارت کے لیے جاتے ہو؟

اور ہمیں "قبور پرستان" کہہ کر پکارتے ہیں۔ حالانکہ پوری دنیا میں لوگ اپنے گذشتہ بزرگوں کی آرام گاہوں کی اہمیت کے قائل ہیں اور انکی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔

مسلمان بھی ہمیشہ اپنے بزرگوں کے مزاروں کی اہمیت کے قائل تھے اور ہیں اور انکی زیارت کے لیے جاتے تھے اور جاتے ہیں۔ صرف ایک چھوٹا سا شدت پسند وہابی ٹولہ انکی مخالفت کرتا ہے اور اپنے آپ کو پوری دنیا کے مسلمان ہونے کا دعویدار اور ٹھیکیدار سمجھتا ہے۔

البتہ بعض مشہور وہابی علماء نے صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ پیغمبر اکرم کی قبر مبارک کی زیارت کرنا مستحب ہے۔ لیکن زیارت کی نیت سے رخت سفر نہیں باندھنا چاہیے۔ یعنی مسجد النبی کی زیارت کے قصد یا اس میں عبادت کی نیت سے یا عمرہ کی نیت سے مدینہ آئیں اور ضمناً پیغمبر اکرم کی قبر کی زیارت بھی کرلیں۔ لیکن خود زیارت کے قصد سے بار سفر نہیں باندھنا چاہیے!۔

"بن باز" مشہور وہابی مفتی کہ جو کچھ عرصہ قبل ہی فوت ہوئے ہیں۔ الجزیرہ اخبار کے مطابق وہ یہ کہتے تھے "جو مسجد نبوی کی زیارت کرے اس کے لیے مستحب ہے کہ روضہ رسول

میں دو رکعت نماز ادا کرے اور پھر آنحضرتؐ پر سلام کہے اور نیز مستحب ہے کہ جنت البقیع میں جا کر وہاں مدفون شہداء پر سلام کہے"(۱)

اہلسنت کے چاروں ائمہ "الفقہ علی المذاہب الاربعہ" کی نقل کے مطابق پیغمبر اکرمؐ کی قبر مبارک کی زیارت کو بغیر ان قیود اور شروط کے مستحب سمجھتے ہیں۔

اس کتاب میں یوں نقل ہوا ہے "پیغمبر اکرمؐ کی قبر کی زیارت اہم ترین مستحبات میں سے ہے اور اس بارے میں حسنہ احادیث نقل ہوئی ہیں" اس کے بعد انہوں نے چھ احادیث نقل کی ہیں۔(۲)

یہ وہابی ٹولہ اس مسئلہ میں مجموعی طور پر تین نکات میں دنیا کے باقی مسلمانوں کے ساتھ اختلاف رکھتا ہے۔

۱۔ قبروں پر تعمیر کرنا

۲۔ قبور کی زیارت کے لیے سفر کا سامان باندھنا (شد رحال)

۳۔ خواتین کا قبروں پر جانا

انہوں نے بعض روایات کے ذریعے ان تین موارد کی حرمت کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان روایات کی یا تو سند درست نہیں یا اس مطلب پر ان کی دلالت مردود ہے (انشاء اللہ عنقریب ان روایات کی تشریح بیان کی جائے گی) ہمارے خیال کے مطابق یہ لوگ اس حرکت کے لیے کچھ اور مقصد رکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ یہ لوگ توحید و شرک والے مسئلہ وسوسے میں گرفتار ہیں۔ شاید خیال کرتے ہیں کہ قبروں کی زیارت کرنا انکی پوجا کرنے کے مترادف ہے اس لیے انکے علاوہ پوری دنیا کے مسلمان انکے نزدیک مشرک اور ملحد ہیں!!

۱) الجزیرہ اخبار شمارہ ۶۸۲۹ (۲۲ ذی القعدہ ۱۴۱۱ق)۔
۲) الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد ۱، ص ۵۹۰۔

زیارت قبول کی گذشتہ تاریخ:

گذشتہ لوگوں کی قبروں کا احترام (بالخصوص بزرگ شخصیات کی قبروں کا احترام) بہت قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ ہزاروں سال پہلے سے لوگ اپنے مردوں کا احترام کرتے تھے اور انکی قبروں اور بالخصوص بزرگان کی قبروں کی تکریم کرتے تھے۔ اس کام کا فلسفہ اور مثبت آثار بہت زیادہ ہیں۔

۱۔ گذشتہ لوگوں کی تکریم کا سب سے پہلا فائدہ، ان بزرگوں کی حرمت کی حفاظت ہے اور ان کی قدردانی انسانی عزت و شرافت کی علامت ہے۔ اسی طرح جوانوں کے لیے ان کی سیرت پر عمل پیرا ہونے کے لیے تشویق کا باعث بنتی ہے۔

۲۔ دوسرا فائدہ ان کی خاموش مگر گویا قبروں سے درس عبرت حاصل کرنا اور آئینہ دل سے غفلت کے زنگ کو دور کر کے دنیاوی زرق و برق کے مقابلے میں ہوشیاری اور بیداری پیدا کرنا ہے اور ہوا و ہوس پر قابو پانا ہے۔

جیسا کہ امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ مردے بہترین وعظ و نصیحت کرنے والے ہیں۔

۳۔ تیسرا فائدہ پسماندگان کی تسلی کا حصول ہے کیونکہ لوگ اپنے عزیزوں کی قبروں پر سکون کا احساس کرتے ہیں۔ گویا وہ انکے ساتھ ہمنشین ہیں۔ اسطرح قبروں پر جانے سے انکے غم کی شدت میں کمی آجاتی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ جو جنازے مفقود الاثر ہو جاتے ہیں انکے وارث انکے لیے ایک قبر کی علامت اور شبیہ بنا لیتے ہیں اور وہاں پر انہیں یاد کرتے ہیں۔

۴۔ چوتھا فائدہ یہ کہ گذشتہ شخصیات کی قبروں کی تعظیم و تکریم ہر قوم و ملت کی ثقافتی میراث کو زندہ رکھنے کا ایک طریقہ شمار ہوتی ہے اور ہر قوم اپنی قدیم ثقافت کے ساتھ زندہ رہتی ہے۔ پوری دنیا کے مسلمان ایک عظیم اور بے نیاز ثقافت رکھتے ہیں جس کا ایک اہم حصہ

شہداء، علمائے سلف اور سابقہ دانشوروں کی آرامگاہوں کی صورت میں ہے اور بالخصوص بزرگان دین اور روحانی پیشواؤں کے مزاروں میں نہفتہ ہے۔ ایسے بزرگوں کی قبور کی یادمنانا اور انکی حفاظت وتکریم اسلام اور سنتِ پیغمبرؐ کی حفاظت کا موجب بنتی ہے۔

وہ لوگ کتنے بے سلیقہ ہیں جنہوں نے مکہ، مدینہ اور بعض دوسرے شہروں میں بزرگان اسلام کے پرافتخار آثار کو محو کر کے اسلامی معاشرے کو عظیم خسارے سے دوچار کر دیا ہے۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ نادان اور محدود فکر رکھنے والے سلفیوں نے غیر معقول بہانوں کی آڑ میں یہ کام کر کے پیکر اسلام کی ثقافتی میراث پر ایسی شدید ضربیں لگائی ہیں جنکی تلافی ناممکن ہے۔

کیا یہ عظیم تاریخی آثار صرف اس ٹولے کے ساتھ مخصوص ہیں کہ اسقدر بے رحمی کے ساتھ انہیں نابود کیا جارہا ہے۔ کیا ان آثار کی حفاظت و پاسداری پوری دنیا کے اسلام سے آگاہ دانشوروں کی ایک کمیٹی کے ہاتھ میں نہیں ہونی چاہیے؟

۵۔ پانچواں فائدہ یہ کہ دین کے عظیم پیشواؤں کی قبروں کی زیارت اور بارگاہ الٰہی میں ان سے شفاعت کا تقاضا کرنا عنداللہ، توبہ اور انابہ کے ہمراہ ہوتا ہے۔ اور یہ چیز نفوس کی تربیت اور اخلاق وایمان کی پرورش میں انتہائی مؤثر ہے۔ بہت سے گناہوں میں آلودہ لوگ جب انکی بارگاہ ملکوتی میں حاضری دیتے ہیں تو توبہ کر لیتے ہیں اور ہمیشہ کے لیئے ان کی اصلاح ہوجاتی ہے۔ اور جو نیک وصالح افراد ہوتے ہیں انکے روحانی ومعنوی مراتب میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔

قبور کی زیارت کے سلسلہ میں شرک کا توہم:

کبھی کمزور فکر لوگ ائمہ اطہار کی قبور کے زائرین پر "شرک" کا لیبل لگادیتے ہیں یقیناً اگر

وہ زیارت کے مفہوم اور زیارت ناموں میں موجود مواد سے آگاہی رکھتے تو اپنی ان باتوں پر شرمندہ ہوتے۔

کوئی بھی عقلمند آدمی پیغمبر اکرمؐ یا آئمہ علیہم السلام کی پرستش نہیں کرتا ہے۔ بلکہ یہ بات تو انکے ذہن میں خطور بھی نہیں کرتی ہے۔ تمام آگاہ مؤمنین احترام اور طلب شفاعت کے لیئے زیارت کو جاتے ہیں۔

ہم اکثر اوقات زیارت نامہ پڑھنے سے پہلے سو مرتبہ "اللہ اکبر" کہتے ہیں اور اسطرح سو مرتبہ توحید کی تاکید کرتے ہیں اور شرک کے ہر قسم کے شبہہ کو اپنے سے دور کرتے ہیں۔

معروف زیارت نامہ "امین اللہ" میں ہم آئمہ کی قبروں پر جا کر یوں کہتے ہیں:

"اشھد انک جاھدت فی اللّٰہ حق جھادہ و عملت بکتابہ و اتبعت سنن نبیہ حتیٰ دعاک اللّٰہ الیٰ جوارہ"

"ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے راہ خدا میں جہاد کیا اور جہاد کا حق ادا کر دیا۔ کتاب خدا پر عمل کیا اور سنتِ پیغمبرؐ کی پیروی کی یہانتک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس جہان سے اپنی جوار رحمت میں بلا لیا۔"

کیا اس سے بڑھ کر توحید ہوسکتی ہے؟

اسی طرح مشہور زیارت جامعہ کبیرہ میں ہم یوں پڑھتے ہیں کہ:

"الیٰ اللّٰہ تدعون و علیہ تدلون و بہ تؤمنون ولہ تسلمون و بامرہ تعملون و الیٰ سبیلہ

تر شدون"

(ان چھ جملوں میں سب ضمیریں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف لوٹتی ہیں، زائرین یوں کہتے ہیں)" کہ آپ آئمہ، اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے اور اس کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ اور آپ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے سامنے تسلیم ہیں اور لوگوں کو اللہ کے راستے کی طرف ارشاد و ہدایت کرتے ہیں"

ان زیارت ناموں میں ہر جگہ اللہ تعالیٰ اور دعوت توحید کی بات ہے کیا یہ شرک ہے یا ایمان؟ اسی زیارت نامہ میں ایک جگہ یوں کہتے ہیں:

"مستشفعٌ الیٰ اللہ عزّ وجل بکم" میں آپ کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شفاعت کو طلب کرتا ہوں۔

اور اگر بالفرض زیارت ناموں کی بعض تعبیروں میں ابہام بھی ہو تو ان محکمات کیوجہ سے کاملاً روشن ہو جاتا ہے۔

کیا شفاعت طلب کرنا توحیدی نظریات کے ساتھ سازگار ہے؟

ایک اور بڑی خطا جس سے وہابی دوچار ہوئے ہیں یہ ہے کہ وہ بارگاہ رب العزت میں اولیاء الٰہی سے شفاعت طلب کرنے کو بتوں سے شفاعت طلب کرنے پر قیاس کرتے ہیں (وہی بُت جو بے جان اور بے عقل و شعور ہیں)

حالانکہ قرآن مجید نے کئی بار بیان کیا ہے کہ انبیاء الٰہی، اسکی بارگاہ میں گناہگاروں کی شفاعت کرتے تھے۔ چند نمونے حاضر خدمت ہیں:

۱۔ برادران یوسف نے حضرت یوسفؑ کی عظمت اور اپنی غلطیوں کو سمجھنے کے بعد حضرت

یعقوبؑ سے شفاعت کا تقاضا کیا اور انہوں نے بھی انہیں مثبت وعدہ دیا۔

"قالوا یا ابانا استغفر لنا ذنوبنا انا کنا خاطئین، قال سوف استغفر لکم ربی انہ ھو الغفور الرحیم"(۱)

کیا (معاذ اللہ) یعقوب مشرک پیغمبرؑ تھے؟

۲۔ قرآن مجید گنہگاروں کو توبہ اور پیغمبر اکرمؐ سے شفاعت طلب کرنے کی تشویق کرتے ہوئے یوں فرماتا ہے:

"ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جاءوک فاستغفروا اللہ و استغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما"

"جب بھی وہ اگر اپنے آپ پر (گناہوں کی وجہ سے) ظلم کرتے اور آپ کی خدمت میں آتے اور توبہ کرتے اور رسولؐ بھی انکے لیے استغفار کرتے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنیوالا اور مہربان پاتے"(۲)

کیا یہ آیت شرک کی طرف تشویق کر رہی ہے؟

۳۔ قرآن مجید منافقین کی مذمت میں یوں کہتا ہے:

"و اذا قیل لھم تعالوا یستغفر لکم رسول اللہ لووا رؤوسھم و رایتھم یصدون و ھم مستکبرون"(۳)

۱) سورۂ یوسف آیات ۹۷، ۹۸۔
۲) سورۂ نساء آیت ۶۴۔
۳) سورۂ منافقون آیت ۵۔

جب انہیں کہا جاتا ہے کہ آؤ تا کہ رسول خدا تمہارے لیئے مغفرت طلب کریں تو وہ (طنزیہ) سر ہلاتے ہیں اور آپ نے دیکھا کہ وہ آپکی باتوں سے بے پرواہی برتتے اور تکبر کرتے ہیں"

کیا قرآن مجید، کفار اور منافقین کو شرک کی طرف دعوت دے رہا ہے؟

۴۔ ہم جانتے ہیں کہ قوم لوط بدترین امت تھی لیکن اس کے باوجود حضرت ابراہیم شیخ الانبیاء نے انکے بارے میں شفاعت کی (اور خداوند سے درخواست کی کہ انہیں مزید مہلت دی جائے شاید توبہ کرلیں) لیکن یہ قوم چونکہ اپنی حد سے بڑھی ہوئی بداعمالیوں کی وجہ سے شفاعت کی قابلیت کھو چکی تھی۔ اس لیے حضرت ابراہیم کو کہا گیا کہ انکی شفاعت سے صرف نظر کیجئے۔

"فلمّا ذھبَ عنْ ابراھیمَ الرّوعُ و جاءتهُ البُشریٰ یُجادلُنا فی قومِ لوط. انّ ابراھیمَ لحلیمٌ اوّاهٌ مُنیبٌ. یا ابراھیمُ اعرِض عن ھذا انّه قد جاء امرُ ربّک و انّھم آتیھمْ عذابٌ غیرُ مردُود" (۱)

"جس وقت ابراہیم کا خوف (اجنبی فرشتوں کی وجہ سے) ختم ہو گیا اور (بیٹے کی ولادت کی) بشارت انہیں مل گئی تو قوم لوط کے بارے میں ہم سے گفتگو کرنے لگے (اور شفاعت کرنے لگے) کیونکہ ابراہیم بردبار، دلسوز اور توبہ کرنے والے تھے (ہم نے ان سے کہا) اے ابراہیم اس (درخواست) سے صرف نظر کیجئے کیونکہ آپ کے پروردگار کا فرمان پہنچ چکا ہے اور یقینی طور پر ناقابل رفع عذاب انکی طرف آئیگا"

(۱) سورۃ ہود آیات ۷۴ تا ۷۶۔

دلچسپ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شفاعت کے مقابلے میں حضرت ابراہیم کی عجیب تمجید فرمائی اور کہا" إنّ ابراھیم لحلیم اوّاہٌ مُنیبٌ" لیکن اس مقام پر انہیں تذکر دیا ہے کہ پانی سر سے گذر چکا ہے اور شفاعت کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔

اولیاء الٰہی کی شفاعت انکی ظاہری زندگی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے:

بہانہ تلاش کرنے والے جب ایسی آیات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ جن میں صراحت کے ساتھ انبیائے الٰہی کی شفاعت کی قبولیت کا تذکرہ ہے اور ان آیات کو قبول کرنے کے سوا، کوئی چارہ بھی نہیں ہے تو پھر ایک اور بہانہ بناتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ یہ آیات انبیاء کرام کی زندگی کے ساتھ مربوط ہیں۔ ان کی وفات کے بعد شفاعت پر کوئی دلیل نہیں ہے اسطرح شرک والی شاخ کو چھوڑ کر دوسری شاخ کو پکڑتے ہیں۔

لیکن اس جگہ یہ سوال سامنے آئیگا کہ کیا پیغمبر اکرمؐ اپنی رحلت کے بعد خاک میں تبدیل اور مکمل طور پر نابود ہو گئے ہیں یا حیات برزخی رکھتے ہیں؟ (جسطرح بعض وہابی علماء نے ہمارے سامنے اس بات کا اقرار کیا ہے)

اگر حیات برزخی نہیں رکھتے تو اولاً کیا پیغمبر اکرمؐ کا مقام شہداء سے کم ہے جنکے بارے میں قرآن مجید گواہی دیتا ہے کہ " بل احیاءٌ عند ربھم یرزقون"(۱)

ثانیاً: تمام مسلمان نماز کے تشہد میں آنحضرتؐ پر سلام بھیجتے ہیں اور یوں کہتے ہیں: "السلام علیک ایھا النبیّ......" اگر آنحضرتؐ موجود نہیں ہیں تو کیا یہ کسی خیالی شے کو سلام کیا جاتا ہے؟

(۱) سورۃ آل عمران آیت ۱۶۹۔

ثالثاً: کیا آپ معتقد نہیں ہیں کہ مسجد نبوی میں پیغمبر اکرمؐ کے مزار کے قریب آہستہ بولنا چاہیے کیونکہ قرآن مجید نے حکم دیا ہے کہ "یا ایھا الذین آمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی......" (۱) اور اس آیت کو تحریر کرکے آپ لوگوں نے پیغمبر اکرمؐ کی ضریح پر نصب کیا ہوا ہے؟

ہم ان متضاد باتوں کو کیسے قبول کریں!

رابعاً: موت نہ فقط زندگی کا اختتام نہیں ہے بلکہ ایک نئی ولادت اور زندگی میں وسعت کا نام ہے۔ "الناس نیامٌ فاذا ماتوا انتبھوا" (۲) لوگ غفلت میں ہیں جب مریں گے تو بیدار ہونگے۔

خامساً: ایک معتبر حدیث میں جسے اہلسنت کی معتبر کتب میں ذکر کیا گیا ہے۔ عبداللہ بن عمر نے رسولخداؐ سے یوں نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "من زارَ قبری وَجَبَتْ له شفاعتی" (۳) جس نے میری قبر کی زیارت کی اسکے لیے میری شفاعت یقینی ہوگی۔

ایک اور حدیث میں یہی راوی پیغمبر اکرمؐ سے نقل کرتا ہے "من زارنی بعد موتی فانما زارنی فی حیاتی" (۴) جس نے میری رحلت کے بعد میری زیارت کی وہ ایسا ہی

---

۱) سورۂ حجرات آیت ۲۔ اے صاحبان ایمان، اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے بلند نہ کیجئے۔

۲) عوالی اللئالی، جلد ۴ ص ۷۳۔

۳) دار قطنی مشہور محدث نے اس حدیث کو اپنی کتاب "سنن" میں نقل کیا ہے (جلد ۲ ص ۲۷۸) دلچسپ یہ ہے کہ علامہ امینی نے اسی حدیث کو اہلسنت کی ۴۱ مشہور کتابوں سے نقل کیا ہے ملاحظہ فرمائیں الغدیر ج ۵ ص ۹۳۔

۴) (سابقہ مدرک) علامہ امینی نے اس حدیث کو ۱۳ کتابوں سے نقل کیا ہے۔

ہے جیسے اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی ہو"

لہذا حیات اور ممات کے درمیان فرق ڈالنا صرف ایک موہوم خیال ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس حدیث کے اطلاق سے یہ بھی بخوبی معلوم ہوجاتا ہے کہ آپ کی قبر کی زیارت کے قصد سے "شدّ رحال" سامان باندھنے اور سفر کرنے میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

خواتین اور قبور کی زیارت

خواتین زیادہ عطوفت اور رقتِ قلب کی وجہ سے اپنے عزیزوں کی قبروں پر جانے کی زیادہ ضرورت محسوس کرتی ہیں تاکہ انہیں صبر اور تسلی حاصل ہوسکے۔ اور تجربے کے ذریعے یہ بات ثابت ہے کہ اولیاء الٰہی کی قبور کی زیارت کے لیے بھی وہ زیادہ مشتاق ہوتی ہیں۔

لیکن مقام افسوس ہے کہ یہ وہابی ٹولہ ایک مشکوک حدیث کی خاطر، خواتین کو ان قبور کی زیارت سے شدت سے منع کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ جنوبِ ایران میں انکی عوام کی زبانوں پر یہ بات مشہور ہے کہ اگر کوئی عورت کسی کی قبر پر جائے تو وہ مُردہ اس خاتون کو بالکل برہنہ حالت میں دیکھتا ہے!

ایک عالم کہہ رہے تھے میں نے وہابیوں سے کہا کہ پیغمبر اکرمؐ اور خلیفۂ اوّل و دوّم کی قبریں حضرت عائشہ کے کمرے میں تھیں اور وہ کافی عرصہ تک اُسی کمرہ میں رہتی رہیں یا کم از کم کمرہ میں آمد و رفت رکھتی تھیں۔

بہرحال (خواتین کے لیے زیارتِ قبور کی حرمت پر) ان کے پاس دلیل کے طور پر ایک مشہور حدیث ہے جسے وہ رسولخداؐ کی طرف نسبت دیتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "لعن اللہ زائراتِ القبور" "اللہ تعالیٰ قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کرے"

بعض کتابوں میں ''زائرات'' کے لفظ کی بجائے ''زوّارات القبور'' نقل کیا گیا ہے کہ جو مبالغہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اہلسنت کے بعض علماء جیسے ترمذی (۱) وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس زمانے کے ساتھ مخصوص ہے جب آنحضرتؐ نے اس بات سے منع فرمایا تھا۔ بعد میں یہ حکم نسخ ہو گیا تھا اور آپؐ نے اجازت فرما دی تھی......

بعض دیگر علماء کہتے ہیں کہ یہ حدیث ان خواتین کے ساتھ مخصوص ہے جو اپنا زیادہ وقت زیارت قبور کے لیے صرف کرتی تھیں اور اس طرح انکے شوہروں کے حقوق ضائع ہوتے تھے اور لفظ ''زوّارات'' والا نسخہ کہ جو مبالغے کا صیغہ ہے اس بات کی دلیل ہے۔

یہ برادران چاہے سب چیزوں کا انکار کر دیں لیکن حضرت عائشہ کے کام کا تو انکار نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ پیغمبر اکرمؐ اور پہلے و دوسرے خلیفہ کی قبریں انکے گھر میں تھیں اور وہ ہمیشہ ان قبروں کے نزدیک تھیں۔

''شدّ رحال'' فقط تین مساجد کے لیے!

تاریخ اسلام میں صدیوں سے مسلمان، پیغمبر اکرمؐ اور بزرگان بقیع کی قبور کی زیارت کے لیے شدّ رحال کرتے تھے (یعنی اس زیارت کے قصد سے سامان باندھتے) اور سفر کرتے تھے اور کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔

---

۱) سنن ترمذی، جلد ۳ص ۳۷۱ (انہوں نے باب کا عنوان یہ رکھا ہے '' باب ما جاء من الرخصة فی زیارة القبور'' یعنی وہ باب جس میں زیارت قبور کی اجازت دی گئی ہے۔

یہاں تک کہ ساتویں صدی میں ابن تیمیہ کا زمانہ آیا اور اس نے اپنے پیروکاروں کو اس بات سے منع کیا اور کہا کہ ''شدّ رحال'' صرف تین مسجدوں کی زیارت کے لیے جائز ہے اور بقیہ مسجدوں کے لیے حرام ہے اور اس بارے میں دلیل کے طور پر ابو ہریرہ کی اس حدیث کو نقل کیا کہ ابو ہریرہ نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

''لاتشدّ الرحال الا الیٰ ثلاثة مساجد، مسجدی هذا و مسجد الحرام و مسجد الاقصیٰ'' (۱)

صرف تین مساجد کے لیئے رخت سفر باندھا جاتا ہے ایک میری مسجد اور دوسری مسجد الحرام اور تیسری مسجد الاقصیٰ (۱)

حالانکہ اولاً اس حدیث کا موضوع مساجد کے ساتھ مخصوص ہے نہ دوسرے مقامات کی زیارت کے ساتھ۔ لہٰذا اس حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ تین مساجد کے علاوہ دیگر مسجدوں کے لیے سامان سفر نہیں باندھا جاتا ہے۔

ثانیاً: یہ حدیث ایک اور طرح بھی نقل ہوئی ہے اور اس نقل کے مطابق انکے مقصود پر اصلاً دلالت نہیں کرتی ہے وہ اسطرح کہ ''تشدّ الرحال الی ثلاثِ مساجد'' تین مساجد کے لیے سامان سفر باندھا جاتا ہے'' (۱) اور یہ درحقیقت اس کام پر تشویق کرتا ہے۔ اس تشویق سے دوسرے مقامات کی زیارت کی نفی نہیں ہوتی ہے کیونکہ ایک شے کے ثابت کرنے سے دوسری شے کی نفی نہیں ہوتی۔ اور چونکہ معلوم نہیں ہے کہ اصل حدیث کا متن پہلی طرح یا دوسری طرح تھا اس لیے حدیث مجمل ہو جائیگی اور استدلال کے قابل نہیں رہے گی۔

---

۱) صحیح مسلم جلد ۴ص ۱۲۶۔
۲) مصدر سابق۔

ممکن ہے کوئی کہے کہ اسی کتاب میں دوسرے مقام پر یوں نقل کیا گیا ہے کہ "انسـ... یسافر الیٰ ثلاثۃ مساجد" سفر صرف تین مساجد کے لیے جائز ہے"

لہٰذا شد رحال صرف تین مساجد کے لیے جائز ہے!

اس سوال کا جواب واضح ہے اولاً: امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ بہت سے دینی اور غیر دینی سفر مختلف مقاصد کے لیے جائز ہیں۔ سفر صرف تین مساجد کے لیے منحصر نہیں ہے بلکہ یہ حصر اصطلاحاً "حصر اضافی" ہے یعنی مساجد میں سے یہ تین مسجدیں ہیں جنکے لیے شد رحال کیا جاتا ہے۔ ثانیاً: حدیث کا متن مشکوک ہے معلوم نہیں ہے کہ پہلا متن درست ہے یا دوسرا یا تیسرا۔ اور یہ انتہائی بعید ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے اس مطلب کو تین مرتبہ مختلف الفاظ میں بیان کیا ہو۔ ظاہراً یہ لگتا ہے کہ راویوں نے نقل بہ معنی کیا ہے لہٰذا اس حدیث میں ابہام پایا جاتا ہے اور جب کسی حدیث کا متن مبہم ہو تو اس کے ساتھ کیا گیا استدلال معتبر نہیں ہوتا ہے۔

کیا قبور پر عمارت بنانا ممنوع ہے؟

صدیوں سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے کہ مسلمان بزرگان اسلام کی قبور پر تاریخی اور ... عمارتیں تعمیر کرتے تھے اور ان کی قبور کی زیارت کے لیے آتے اور ان سے متبرک ہوتے تھے اور اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کرتا تھا۔ حقیقت میں اس عمل پر مسلمانوں کا اجماع تھا اور اس سیرت عملی کے بارے میں کسی کا اختلاف نہیں تھا۔

مورخین نے تاریخ میں جیسے مسعودی نے مروج الذہب میں (کہ جنہوں نے چوتھی صدی میں زندگی گذاری ہے) اور سیاحوں جیسے ابن جبیر اور ابن بطوطہ نے ساتویں آٹھویں صدی میں اپنے سفرناموں میں اس قسم کی عظیم عمارتوں کا تذکرہ کیا ہے۔

۱) صحیح مسلم ج ۴ ص ۱۲۶۔

یہاں تک کہ ساتویں صدی میں ابن تیمیہ اور بارہویں صدی میں انکے شاگرد محمد ابن عبدالوہاب پیدا ہوئے اور انہوں نے قبور پر ان عمارتوں کو بدعت، شرک اور حرام قرار دیا۔

وہابیوں کے پاس چونکہ اسلامی مسائل کی تحلیل کے لیے علمی قدرت کم تھی اس لیے انہوں توحید اور شرک کے مسئلہ میں وسواس کا شکار ہو گئے۔ انہیں جہاں بھی کوئی دستاویز ملی اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی لیے زیارت، شفاعت، قبروں پر عمارات اور دیگر مسائل کو انہوں نے شریعت کے خلاف شمار کرتے ہوئے شرک اور بدعت کے ساتھ تعبیر کیا۔ اور ان میں سے اہم ترین مسئلہ بزرگان دین کی قبروں پر تعمیرات کرانے کا مسئلہ ہے آج بھی سوائے حجاز کے پوری دنیا میں سابقہ انبیاء اور بزرگان دین کی قبور پر عظیم تاریخی عمارتیں موجود ہیں جو بہت سی تاریخی یادوں کو تازہ کرتی ہیں۔

مصر سے لیکر ہندوستان تک اور الجزائر سے لیکر انڈونیشیا تک سب لوگ اپنے ملک میں موجود اسلامی آثار کا احترام کرتے ہیں اور بزرگان دین کی قبروں کے لیے ایک خاص اہمیت کے قائل ہیں۔ لیکن حجاز میں ایسی بات نظر نہیں آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ اسلامی مفاہیم کی صحیح تحلیل نہیں کر پائے ہیں۔

وہابیت کے ہاتھوں ثقافتی میراث کی نابودی

گذشتہ صدی میں سرزمین وحی پر ایک تلخ واقعہ رونما ہوا جس نے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے اسلامی تاریخ کے آثار سے محروم کر دیا اور وہ حادثہ وہابیت کا برسر اقتدار آنا تھا۔ تقریباً یہی (۸۰) سال پہلے (۱۳۴۴ھ ق) جب حجاز کی حکومت وہابیت کے ہاتھوں آئی تو انہوں نے ایک بے بنیاد سازش کے تحت تمام اسلامی تاریخ کی عمارتوں کو شرک یا بدعت کے بہانے سے

ویران کر کے خاک کے ساتھ یکساں کر دیا۔

البتہ انکی یہ جرأت نہ ہوئی کہ پیغمبر گرامی اسلام کی قبر مطہر کو خراب کریں۔ اس خوف سے کہ کہیں پوری دنیا کے مسلمان انکے خلاف اٹھ کھڑے نہ ہوں اور حقیقت میں ان تقیہ کے مخالفین نے دوسرے سب مسلمانوں سے تقیہ کیا!

مکہ مکرمہ کے بعض سفروں کے دوران ہم نے دوستانہ ماحول میں وہابیت کے بزرگوں سے یہ دریافت کیا کہ آپ نے سوائے روضۂ رسولؐ کے باقی سب قبور کو ویران کر دیا ہے اس کے باقی رکھنے کا راز کیا ہے؟ تو اس سوال کے جواب میں انکے پاس کوئی عذر و بہانہ نہیں تھا۔

بہر حال قوموں کی حیات مختلف امور کے ساتھ وابستہ ہے جن میں سے ایک انکی میراث اور اپنے دینی و علمی آثار کی حفاظت ہے۔ جبکہ نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ سرزمین وحی بالخصوص مکہ اور مدینہ میں مسلمانوں کی غلط تدبیر کی وجہ سے ایک خاص ذہنیت رکھنے والے کج سلیقہ اور متعصب ٹولے نے اسلام کی انتہائی قیمتی میراث کو مختلف بہانوں کے ذریعہ برباد کر دیا ہے۔ ایسی میراث جس کی ہر ایک عمارت اسلام کی پر افتخار تاریخ کو یاد دلاتی تھی۔

صرف آئمہ اطہارؑ اور جنت البقیع میں مدفون دوسرے بزرگوں کی قبروں کو ویران نہیں کیا گیا بلکہ اس ٹولے نے جہاں بھی کہیں اسلامی تاریخ کا کوئی اثر پایا اسے ویران کر دیا اور اس سے ایک بہت بڑا ناقابل تلافی خسارہ مسلمانوں کے دامن گیر ہوا۔

یہ تاریخی آثار ایک عجیب جاذبیت رکھتے تھے۔ اور انسان کو اسلامی تاریخ کی گہرائیوں سے آشنا کرتے تھے۔ جنت البقیع ایک وقت انتہائی باعظمت جلوہ رکھتا تھا اور ہر گوشہ ایک اہم تاریخی حادثہ کی یاد دلاتا تھا لیکن آج ایک ویران بیابان میں تبدیل ہو گیا

جو انتہائی عجیب لگتا ہے اور وہ بھی بڑے بڑے خوبصورت ہوٹلوں اور زرق برق والی عمارتوں کے درمیان اور زیادہ عجیب لگتا ہے۔ اس کے لوہے کی سلاخوں کے دروازے صرف ایک دو گھنٹے کے لیے، وہ بھی فقط مرد زائرین کیلئے کھولے جاتے ہیں۔

بہانے:

ا۔ قبروں کو مسجد نہیں بنانا چاہیے:

کبھی کہتے ہیں کہ قبروں پر عمارت بنانا انکی پرستش کا باعث بنتا ہے۔ اور نبی اکرمؐ کی یہ حدیث اس کے جائز نہ ہونے پر دلیل ہے " **لعن الله اليهود اتخذوا قبور انبيائهم مساجد** " ''اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر لعنت کی ہے کیونکہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنا لیا تھا'' (۱)

سب مسلمانوں پر واضح ہے کہ کوئی بھی اولیائے الٰہی کی قبروں کی پوجا نہیں کرتا ہے۔ اور زیارت اور عبادت کے درمیان واضح فرق ہے۔ ہم جس طرح زندہ لوگوں کی زیارت و ملاقات کے لیے جاتے ہیں بزرگوں کا احترام کرتے ہیں اور اُن سے التماس دُعا کرتے ہیں ایسے ہی مردوں کی زیارت کے لیئے بھی جاتے ہیں اور بزرگان دین اور شہداء فی سبیل اللہ کا احترام کرتے ہیں اور اُن سے التماس دعا کہتے ہیں۔

کیا کوئی بھی عاقل یہ کہتا ہے کہ زندگی میں بزرگوں کی زیارت اس طرح کرنا جس طرح کہ بتایا گیا ہے عبادت یا کفر و شرک ہے؟ مرنے کے بعد بھی انکی زیارت اسی طرح ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری، جلد ۲، ص ۱۱۱، ایک حدیث "والنصاریٰ" کے لفظ کے اضافہ کے ساتھ صحیح مسلم میں بھی آئی ہے (جلد ۲، ص ۶۷)۔

پیغمبر اکرمؐ جنت البقیع میں قبروں کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے اور کتب اہلسنت میں بھی بہت سی روایات پیغمبر اکرمؐ کی قبر اور دیگر قبور کی زیارت کے بارے میں ذکر ہوئی ہیں۔ اگر اللہ تعالی نے یہودیوں پر لعنت کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ (سجدہ کا مقام) قرار دیا تھا۔ جبکہ کوئی بھی مسلمان کسی قبر کو اپنا سجدہ کا مقام قرار نہیں دیتا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آج بھی پیغمبر اسلام کا روضہ مبارک، مسجد نبوی کے ساتھ موجود ہے اور تمام مسلمان حتی کہ وہابی بھی اس روضہ مقدسہ (مسجد نبوی کے اس حصے میں جو آنحضرت کی قبر مبارک سے متصل ہے) کے ساتھ پانچ وقت واجب نمازیں اور اس کے علاوہ مستحب نمازیں پڑھتے ہیں اور آخر میں پیغمبر اکرمؐ کی قبر کی زیارت کرتے ہیں۔ کیا یہ کام قبروں کی پوجا شمار ہوتا ہے اور حرام ہے؟ یا یہ کہ پیغمبر اکرمؐ کی قبر اس حرمت سے مستثنی ہے؟ کیا غیر خدا کی پوجا کی حرمت کی دلیلیں بھی قابل استثناء ہیں؟!

یقیناً قبروں کی زیارت انکی عبادت شمار نہیں ہوتی ہے اور پیغمبر اکرمؐ کی قبر مبارک کے ساتھ یا دیگر اولیاء الٰہی کی قبروں کے نزدیک نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور مندرجہ بالا حدیث ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو واقعاً قبروں کی پوجا اور پرستش کرتے تھے۔ جو لوگ شیعوں کی اپنے آئمہ اطہار کی قبور کی زیارت کے ساتھ آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ جب واجب نمازوں کے اوقات میں مؤذن اذان دیتا ہے تو سب رو بہ قبلہ کھڑے ہو کر ان نمازوں کو جماعت کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ اور زیارت کرتے وقت سب سے پہلے سو مرتبہ تکبیر کہتے ہیں اور زیارت کے بعد دو رکعت نماز زیارت رو بہ قبلہ انجام دیتے ہیں تا کہ ابتداء اور انتہاء میں روشن ہو جائے کہ پرستش صرف اللہ تعالی کے ساتھ مخصوص ہے۔

لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ کچھ خاص مقاصد کی خاطر تہمت، افتراء اور جھوٹ کے دروازے کھول دیئے گے ہیں اور وہابی حضرات جو کہ اقلیت میں ہیں اپنے تمام مخالفین پر قسم قسم کی تہمتیں لگاتے ہیں۔ انکی باتوں کی بہترین توجیہ ہم یہی کر سکتے ہیں کہ یہ لوگ کم علمی کی وجہ سے مسائل کی درست تحلیل نہیں کر سکتے اور توحید و شرک کی حقیقت کو خوب سمجھ نہیں پائے ہیں اور انہیں عبادت و زیارت میں واضح طور پر فرق معلوم نہیں ہو سکا ہے۔

۲۔ ایک اور بہانہ:

صحیح مسلم سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ ابو الھیاج نے پیغمبر اکرمؐ سے اسطرح حدیث نقل کی ہے:

"قال لی علی ابن ابی طالب الا ابعثک علیٰ ما بعثنی علیہ رسول اللہ ان لا تدع تمثالا الا طمستہ و لا قبرا مشرفا الا سوّیتہ" (۱)

"حضرت علی نے مجھے فرمایا کیا تجھے وہ ذمہ داری سونپوں جو مجھے رسول خداؐ نے سونپی تھی: کہ جہاں (ذی روح) کی تصویر دیکھو مٹا دو اور جہاں کہیں ابھری ہوئی قبر دیکھو اسے صاف کر دو"

اس حدیث سے غلط مفہوم نکالنے کی وجہ سے بعض لوگوں نے بیلچے اٹھا لیے اور تمام بزرگان دین کی قبریں ویران کر دیں۔ صرف پیغمبر اکرمؐ اور پہلے و دوسرے خلیفہ کی قبریں باقی رہنے دیں اور ایسے استثناء کے قائل ہوئے جس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

۱) صحیح مسلم، جلد سوم ص ۶۱ یہ روایت اہلسنت کے بعض دیگر مصادر میں بھی نقل ہوئی ہے

لیکن اولاً: اس حدیث کی سند میں کئی افراد ایسے ہیں جو رجال اہلسنت کے مطابق بھی مورد تائید نہیں ہیں اور ان میں سے بعض دھوکہ وفریب دینے والے شمار ہوتے ہیں جیسے بالخصوص "سفیان ثوری" اور "ابن ابی ثابت"

ثانیاً: بالفرض اگر یہ حدیث صحیح ہو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ قبر کی پشت صاف ہونی چاہیے (مچھلی کی پشت کی طرح ابھری ہوئی نہیں ہونی چاہیے جیسا کہ کفار کی رسم تھی) اور بہت سے اہل سنت فقہاء نے فتویٰ دیا ہے کہ قبر کی پشت صاف اور مسطح ہونی چاہیے اور یہ بات مذکورہ بحث کے ساتھ مربوط نہیں ہے۔

ثالثاً: فرض کر لیتے ہیں کہ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ قبر زمین کے ساتھ ہم سطح ہونی چاہیے اور بالکل ابھری ہوئی نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن اس مسئلہ کا قبروں پر عمارت بنانے سے کیا تعلق ہے؟ فرض کیجیے پیغمبر اکرمؐ کی قبر مبارک کا پتھر زمین کے ساتھ ہم سطح اور اس کے ساتھ ساتھ یہ روضہ گنبد اور بارگاہ جو آجکل موجود ہے یہ بھی باقی ہو ان دونوں کے درمیان کیا منافات ہے؟

جسطرح قرآن مجید میں پڑھتے ہیں کہ جس وقت اصحاب کہف کا راز فاش ہو گیا تو لوگوں نے کہا کہ ان کی قبروں پر عمارت بنائیں گے۔ قرآن مجید یوں فرماتا ہیں "قال الذین غلبوا علیٰ امرھم لنتخذن علیھم مسجداً" جو لوگ انکے واقعہ سے آشنا تھے کہنے لگے ان کے مقام پر مسجد بنائیں گے۔ (۱)

قرآن مجید نے مثبت انداز میں اس داستان کو نقل کیا اور اس پر اعتراض نہیں کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بزرگان کی قبروں کے ساتھ مسجد بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

---

۱) سورۂ کہف آیت ۲۱۔

بزرگانِ دین کی قبور کی زیارت کے مثبت آثار

اگر لوگوں کو صحیح تعلیم دی جائے کہ ہر قسم کے افراط وتفریط سے پرہیز کرتے ہوئے ان مزاروں کے پاس یاد خدا میں رہیں اور اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہوئے اولیائے الٰہی کی افکار سے الہام لیں تو یقیناً یہ قبریں تعلیم وتربیت کا مرکز اور اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ اور تہذیب نفوس کا محور بن جائیں گیں۔

یہ بات ہمارے لیے تجربہ شدہ ہے کہ ہر سال آئمہ اطہار اور شہدائے راہ حق کی قبور کی زیارت کو جانے والے لاکھوں زائرین، بہتر جذبہ اور نورانی، صاف اور پاکیزہ دل کے ساتھ واپس آتے ہیں اور اس زیارت کی نورانیت، کافی عرصہ تک انکے عمل سے نمایاں ہوتی ہے۔ اور جب یہ لوگ ان بزرگان کو درگاہ ربُّ العزت میں شفاعت کے لیے پکارتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی توبہ اور دینی ودنیوی حاجات طلب کرتے ہیں تو روحانی اور معنوی رابطہ برقرار کرنے کی خاطر انکے لیے ضروری ہوتا ہے کہ حتماً گناہوں سے دوری اختیار کریں اور نیکی وپاکی کے راستے پر چلیں۔ اسطرح یہ توسّل انکی نیکی کا باعث بنتا ہے۔

علاوہ برایں بزرگان کی طرف یہ توجہ اور توسّل اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان سے شفاعت طلب کرنا انسان کو مشکلات کے مقابلے میں باہمت بناتا ہے اور مایوسی وناامیدی کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے اور اس کے جسمانی وروحانی درد وغم کا مداوا بنتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی برکتوں کا موجب بنتا ہے۔

ہم زیارت، شفاعت اور توسّل والے مسائل میں کج فہمی کی وجہ سے کیوں لوگوں کو ان روحانی وجسمانی اور معنوی برکتوں سے محروم کریں؟ کونسی عقل سلیم اس بات کی اجازت دیتی

ہے؟ ان روحانی و معنوی منزلوں کو طے کرنے سے روکنا عظیم خسارے اور نقصان کا موجب بنے گا۔ لیکن کیا کریں افسوس یہ ہے بعض لوگوں کے توحید و شرک کے مسئلہ میں بے جا وسواس نے بہت سے لوگوں کو اس عظیم فیض سے محروم کر دیا ہے۔

۳: تبرک کو چاہنا اور طلب کرنا ممنوع ہے۔

بہانہ دیگر: جو لوگ بزرگان کی قبروں کی زیارت کے لیے جاتے ہیں اور ان قبور سے متبرک ہوتے ہیں اور کبھی قبر یا ضریح کو چومتے ہیں۔ اس سے شرک کی بو آتی ہے۔ اس لیے حاجی صاحبان نے دیکھا ہوگا کہ پیغمبر اکرمؐ کی قبر مبارک کے نزدیک ہر طرف سر سخت سپاہی کھڑے ہوتے ہیں اور نبیؐ کے عاشقوں کو ان کی ضریح اور قبر مطہر کی طرف کھلنے والی جالی کے نزدیک جانے سے روکتے ہیں۔ کبھی اس حرمت کو "ابن تیمیہ" اور "محمد ابن عبدالوہاب" کی طرف نسبت دیتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر یہ دو افراد کہ جو وہابیت کے بانی ہیں رسولؐ کے زمانے میں ہوتے اور صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے موقع پر اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ جب آنحضرتؐ وضو کرتے تو اصحاب کرامؓ ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر وضو کا پانی لینے کی کوشش کرتے تا کہ ایک قطرہ بھی زمین پر نہ گرے(۱)

ایسا منظر دیکھ کر اگر یہ افراد زبان سے اعتراض نہ کر سکتے تو دل ہی دل میں ضرور کڑھتے اور یوں کہتے کہ یہ کام پیغمبر اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کی شان کے مطابق نہیں ہے اس سے تو شرک کی بو آتی ہے!

۱) یہ مسئلہ پیغمبر اکرمؐ کی زندگی میں کئی مرتبہ وقوع پذیر ہوا (صحیح مسلم، جلد ۳، ص ۱۹۴۳ اور کنز العمال، جلد ۱۶، ص ۲۴۹ کی طرف رجوع کیا جائے)۔

اور یا اگر یہ لوگ نبی اکرمؐ کی رحلت کے بعد مدینہ میں ہوتے تو اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ آنحضرتؐ کے سب سے پہلے میزبان جناب ابو ایوب انصاری قبر مبارک پر رخسار رکھ کے تبرک حاصل کرتے تھے۔(۱) یا حضرت بلال مؤذن آنحضرتؐ کی قبر کے نزدیک بیٹھ کر شدید گریہ کرتے تھے اور شدت غم کیجہ سے اپنا چہرہ قبر مبارک پر رگڑتے تھے۔(۲) وہابی حضرت بلال اور ابو ایوب انصاری کا گریبان پکڑ کر انہیں دور دھکیلتے کہ یہ کام شرک ہے۔ وہی کام کہ جو آجکل اس مکتب کے پیروکار رسولؐ کے زائرین کے ساتھ کرتے ہیں۔

حالانکہ تبرک حاصل کرنے کا پرستش و پوجا کے ساتھ ذرہ بھر بھی کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اس تبرک کا مطلب ایک قسم کا احترام و ادب ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ جس خدا نے اپنے رسولؐ کو مبعوث فرمایا ہے اس ادب و احترام کی خاطر زیارت کرنیوالے پر اپنی رحمت و برکت نازل فرمائے۔

علمائے اسلام کی اہم ذمہ داری:

اس وجہ سے کہ عوام الناس کے بعض کاموں کی وجہ سے مخالفین کو بہانہ مل جاتا ہے اس لیے تمام علماء اعلام اور دانشمند حضرات کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ عوام کو پیغمبر اکرمؐ، آئمہ بقیع اور دیگر آئمہ اطہار و شہدائے اسلام کی قبور مبارکہ کے نزدیک غیر سنجیدہ حرکات کرنے سے روکیں اور انہیں زیارت، توسل، تبرک اور شفاعت کے حقیقی مفہوم کی تعلیم دیں۔

۱) مستدرک الصحیحین، جلد ۴، ص ۵۶۰۔
۲) تاریخ ابن عساکر، جلد ۷، ص ۱۳۷۔

۵

نکاح موقت

(مُتعہ)

تمام لوگوں پر یہ واضح کردیں کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں اور وہی ذات مسبب الاسباب، قاضی الحاجات، کاشف الکربات اور کافی المہمات ہے۔ اگر ہم پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اطہار کے ساتھ توسل کرتے ہیں تو یہ ذوات مقدسہ بھی اذنِ پروردگار اور اس کی مدد کے ساتھ ہر کام انجام دیتے ہیں۔ یا اس کے حضور ہماری شفاعت اور اس سے ہماری حاجات کے برآنے کا تقاضا کرتے ہیں۔

عوام میں سے بعض لوگوں کا ان قبور مقدسہ کے سامنے سجدہ کرنا یا ایسے جملے ادا کرنا جن سے انکی الوہیت کی بو آتی ہو یا ضریح پر کسی چیز سے گرہ لگانا وغیرہ یہ تمام ناشائستہ امور ہیں اور ان سے مشکل ایجاد ہوتی ہے۔ اور ایک مثبت اور انتہائی تعمیری کام (زیارت) کا چہرہ مسخ ہو جاتا ہے اور تجھ مجھ کو بہانہ مل جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ تمام لوگوں کو زیارت کی برکتوں سے محروم کردیتے ہیں۔

تمام علمائے اسلام اس بات کے قائل ہیں کہ متعہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں ایک عرصہ تک رائج تھا۔ ایک گروہ قائل ہے کہ یہ خلیفہ ثانی کے دور میں خود اس کے توسط سے اور دوسرا گروہ قائل ہے کہ خود پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں متعہ کو دوبارہ حرام کر دیا گیا تھا۔ اور ہم مکتب اہلبیت علیہم السلام کے پیروکاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ متعہ ہرگز حرام نہیں ہوا ہے اور اس کا جواز باقی ہے (البتہ مخصوص شرائط کے ساتھ)

اس عقیدہ میں بہت کم اہلسنت ہمارے ساتھ متفق ہیں جبکہ انکی اکثریت اس مسئلہ میں ہمارے مخالف ہے۔ بلکہ ہمیشہ ہمیں اس بات کا طعنہ دیتے اور اعتراض کرتے ہیں حالانکہ اس مسئلہ میں نہ صرف اعتراض کا مقام نہیں بلکہ یہ بہت سی اجتماعی مشکلات کے حل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اس مطلب کی وضاحت آئندہ ابحاث میں بیان کی جائیگی۔

ضرورت اور نیاز

بہت سے لوگ (بالخصوص جوان لوگ) دائمی نکاح اور شادی کی قدرت نہیں رکھتے ہیں کیونکہ عام طور پر شادی کرنے کے لیے مقدمات، اخراجات اور بہت سی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک بڑی تعداد کے لیے شادی کا انتظام ... ممکن نہیں ہوتا ...

مثال کے طور پر:

۱۔ بہت سے جوان اپنے تعلیمی دور میں شادی کرنے کی قدرت نہیں رکھتے ہیں (بالخصوص ہمارے زمانے میں تو تعلیمی دورانیہ طولانی ہو چکا ہے) کیونکہ نہ تو ان کی کوئی ملازمت وغیرہ ہے اور نہ ہی رہائش کے لیئے کوئی مناسب مکان اور نہ دیگر اخراجات، جس قدر بھی شادی کے ساتھ شادی کرنا چاہیں پھر بھی بنیادی وسائل فراہم نہیں ہیں۔

۲: بعض افراد شادی شدہ ہیں لیکن بیرون ممالک سفر پر جاتے ہیں اور انکے سفر لمبے ہو جاتے ہیں۔ وہاں وہ جنسی محرومیت کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ نہ تو اپنی بیویوں کو ساتھ لے جا سکتے ہیں اور نہ ہی اس ملک میں دوسری شادی کر سکتے ہیں۔

۳: بعض لوگ ایسے ہیں جنکی بیویاں مختلف بیماریوں یا مشکلات کا شکار ہو جاتی ہیں اور اس وجہ سے وہ اپنے شوہروں کی جنسی خواہشات کو پورا نہیں کر سکتی ہیں۔

۴: بہت سے فوجی ایسے ہیں جو بارڈر وغیرہ کی حفاظت کے لیے یا کسی اور مناسبت سے لمبی ڈیوٹی پر اپنے گھر سے دور چلے جاتے ہیں اور وہاں جنسی مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور جیسا کہ آئندہ بیان کیا جائیگا پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں بھی بہت سے اسلامی فوجیوں کے لیئے یہی مشکل پیش آئی اور اسی وجہ سے متعہ کو حلال کیا گیا۔

۵: بعض اوقات حمل کے دوران یا بعض دیگر وجوہات کی بناء پر انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ کچھ عرصہ کے لیئے اپنی بیوی کے ساتھ جنسی روابط ترک کر دے اور ممکن ہے شوہر جوان بھی ہو اور اس محرومیت میں گرفتار ہو۔

اس قسم کی اجتماعی ضروریات اور مشکلات ہمیشہ تھیں اور ہمیشہ رہیں گی اور یہ مسائل صرف

پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ ہمارے زمانے میں تحریک جنسی کے عوامل کی زیادتی کی وجہ سے یہ مسائل شدت اختیار کر چکے ہیں۔

ایسے موقع پر لوگوں کے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ یا تو معاذ اللہ بدکاری اور گناہوں میں آلودہ ہو جائیں یا ایک سادہ سے نکاح یعنی متعہ سے استفادہ کریں کیونکہ اس میں شادی کی مشکلات و مسائل بھی نہیں ہیں اور دوسری طرف یہ وقتی طور پر انسان کی جنسی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ پارسائی کا مشورہ دینا اور دونوں راستوں سے چشم پوشی کرنا اگرچہ اچھا مشورہ ہے لیکن بہت سے مقامات پر قابل عمل نہیں ہے اور کم از کم بعض افراد کیلئے صرف ایک خیالی راستہ ہے۔

نکاح مسیار:

دلچسپ بات یہ ہے کہ حتی متعہ کے منکر علماء (یعنی اکثر اہلسنت برادران) جب جوانوں اور دیگر محروم لوگوں کی طرف سے دباؤ کا شکار ہوئے تو وہ تدریجاً ایک نکاح کے قائل ہو گئے جو متعہ کے مشابہ ہے اور اسے وہ "ازدواج مسیار" کا نام دیتے ہیں۔ گرچہ اس نکاح کا نام نکاح موقت یعنی متعہ نہیں ہے لیکن عمل میں یہ متعہ کے ساتھ کوئی فرق نہیں کرتا ہے۔

پس اسطرح وہ علماء بھی اجازت دیتے ہیں کہ یہ ضرورت مند انسان اس عورت کے ساتھ دائمی نکاح کر سکتا ہے حالانکہ اس کا ارادہ یہ ہے کہ کچھ مدت کے بعد اسے طلاق دے دے گا اور اس کے ساتھ یہ شرط کرتا ہے کہ وہ نفقہ کا حق نہیں رکھے گی اور نہ ہی رات ساتھ سونے اور وراثت کا حق رکھے گی! یعنی بالکل متعہ کے مشابہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس نکاح مسیار میں طلاق کے ذریعہ دونوں جدا ہوتے ہیں جبکہ متعہ میں باقی ماندہ مدت کو بخش کر دینے سے یا

نکاح کی مدت ختم ہو جانے کے ذریعے مرد و عورت ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں کیونکہ انہوں نے ابتداء سے ہی عقد میں ایک محدود مدت معین کی تھی۔

اور اس سے بڑھ کر بھی دلچسپ یہ ہے کہ ماضی قریب میں ہی بعض اہلسنت جوانوں نے کہ جنہیں شادی کی مشکل تھی اور وہ مسائل سے دوچار تھے، انٹرنیٹ کے ذریعے ہمارے ساتھ رابطہ کیا ہے اور سوال کیا کہ کیا ہم متعہ کے مسئلہ میں شیعہ مجتہد کے فتویٰ پر عمل کر سکتے ہیں؟ ہم نے جواب دیا جی ہاں آپ اس مسئلہ میں شیعہ مسلک کے مطابق عمل کر سکتے ہیں۔

جو لوگ متعہ کا انکار کرتے ہیں اور نکاح "مسیار" کو اختیار کرتے ہیں در حقیقت وہ متعہ پر عمل کر رہے ہیں صرف اس کا نام نہیں لینا چاہتے ہیں!

ہاں "ضروریات" انسان کو "حقائق" کے تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں اگرچہ اس کا نام زبان پر نہ لائیں۔

پس یوں نتیجہ لیتے ہیں کہ جو لوگ متعہ کی مخالفت پر اصرار کرتے ہیں وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر برائیوں اور بدکاریوں کے لیے راہ ہموار کر رہے ہیں مگر یہ کہ متعہ کے مشابہ "نکاح مسیار" کا فتویٰ دیں۔ اسی لیے آئمہ اطہارؑ کی روایات میں یہ بات بیان ہوئی ہے "کہ بعض لوگ اسلامی طریقہ کے مطابق نکاح موقت" کی مخالفت نہ کرتے تو کوئی بھی زنا سے آلودہ نہ ہوتا" (۱)

---

۱) امام صادق فرماتے ہیں " لو لا ما نهی عنها عمر ما زنی الا شقی " (وسائل الشیعہ جلد ۱۴ ص ۴۴۰ حدیث ۲۴) اہلسنت کی کتاب میں بھی یہ حدیث کثرت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ قال علی علیہ السلام " لو لا ان عمر نهی عن المتعة ما زنی الا شقی " (تفسیر طبری، جلد ۵، ص ۱۱۹، تفسیر در المنثور، جلد ۲، ص ۱۴۰، تفسیر قرطبی، جلد ۵، ص ۱۳۰)

اسی طرح جو لوگ اس متعہ سے سوء استفادہ کرتے ہیں (حالانکہ یہ محروم لوگوں کی ضروریات اور مسائل کے حل کے لیے شریعت کی طرف سے تجویز ہوا ہے) اور لوگوں کی نظروں میں اس کا چہرہ مسخ کرتے ہیں اور اسے اپنی ہوس رانی کے لیے استعمال کرتے ہیں وہ بھی اسلامی معاشروں میں برائی اور زنا کی راہ ہموار کرنے میں مدد کر رہے ہیں اور گناہ میں آلودہ لوگوں کے ساتھ شریک ہیں کیونکہ یہ لوگ عملاً متعہ کے صحیح استعمال کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

بہرحال اسلام کہ جو الٰہی قانون ہے اور انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے اور انسان کی تمام ضروریات کو احاطہ کیے ہوئے ہے ممکن نہیں ہے کہ متعہ کا مسئلہ اسلام کے احکام میں بیان نہ ہوا ہو جیسا کہ بعد میں بیان کیا جائیگا۔ نکاح موقت پر قرآن مجید بھی شاہد ہے اور احادیث نبویؐ میں بھی یہ مسئلہ بیان ہوا ہے اور اصحاب کی ایک جماعت کا عمل بھی اس پر رہا ہے۔ ہاں بعض لوگ اس اسلامی حکم کے منسوخ ہو جانے کے قائل ہیں اور جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ نسخ کے قائلین کے پاس کوئی معقول اور قانع کنندہ دلیل موجود نہیں ہے۔

متعہ کیا ہے؟

بعض نا آگاہ لوگ "نکاح موقت" کو انتہائی مسخ چہرے کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اسے "گناہ و فحشاء اور جنسی آزادی کو قانونی شکل دینے" کے مترادف شمار کرتے ہیں!!

اگر اس قسم کے لوگ سب کے سب عوام الناس میں سے ہوتے تو کوئی مشکل نہیں تھی لیکن افسوس یہ ہے کہ اہلسنت کے بعض علماء بھی اس قسم کی نازیبا نسبتیں دیتے ہیں۔ یقیناً شدید مذہبی تعصب انہیں اپنے مد مقابل کی کتابوں کا مطالعہ کر [illegible]

بعض علماء نے تو اس مسئلہ میں شیعوں کی کتب کی ایک سطر کا بھی مطالعہ نہ کیا ہو اور اسی بات پر ہمیں افسوس ہے۔

اس لیے ہم اس مختصری کتاب میں نکاح موقت کی شرائط اور اس کا نکاح دائم کے ساتھ فرق واضح الفاظ میں بیان کریں گے تاکہ سب پر حجت تمام ہو جائے۔

نکاح موقت اکثر شرائط و احکام میں نکاح دائم ہی کی طرح ہے۔

۱۔ مرد و عورت دونوں مکمل رضایت اور اختیار کے ساتھ بغیر کسی جبر کے ایک دوسرے کا میاں بیوی بننے اور شادی کے لیئے قبول کریں۔

۲۔ عقد کا صیغہ لفظ "نکاح" "ازدواج" یا "متعہ" کے ذریعے جاری کیا جائے اس کے علاوہ دوسرے الفاظ کافی نہیں ہیں۔

۳۔ اگر لڑکی باکرہ ہو تو ولی کی اجازت ضروری ہے اگر باکرہ نہ ہو تو اجازت شرط نہیں ہے۔

۴۔ عقد کی مدت اور حق مہر دقیق اور واضح طور پر معین کیا جائے۔ اگر مدت کو نکاح کے درمیان بیان کرنا بھول جائے تو بہت سے فقہاء کے فتوٰی کے مطابق یہ عقد، نکاح دائم میں تبدیل ہو جائیگا (اور یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ہر دو نکاح کی حقیقت ایک ہی ہے صرف مدت کے ذکر کرنے یا نہ کرنے کے اعتبار سے فرق ہے) (توجہ فرمایئے)

۵۔ مدت کا اختتام، طلاق کی مثل ہے بلا فاصلہ عورت کو عدت گزارنا ہوگی (البتہ اگر آمیزش واقع ہوئی ہے)

۶۔ عقد دائم کی عدت تین مرتبہ ماہواری کا دیکھنا ہے یعنی تیسری مرتبہ ماہواری دیکھنے کے بعد عدت تمام ہو جائیگی۔ لیکن عقد موقت کی عدت دو مرتبہ ماہواری کا دیکھنا ہے۔

۷۔ عقد متعہ سے پیدا ہونے والے بچے شرعی حوالے سے اولاد شمار ہوتے ہیں۔ انکے لیئے تمام وہی احکام ہیں جو عقد دائم سے پیدا ہونے والے بچوں کے احکام ہیں۔ اور اسی طرح یہ بچے ماں، باپ، بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں سے وراثت بھی پائیں گے۔ ان بچوں اور دائمی شادی سے پیدا ہونے والے بچوں کے حقوق میں کوئی فرق نہیں ہے۔

یہ بچے بھی ماں، باپ کی کفالت میں رہیں گے ان کے تمام اخراجات اور نفقہ نکاح دائمی سے ہونے والے بچوں کی طرح لازمی ہے کہ ادا کیئے جائیں۔

بعض لوگ یہ شرائط سن کر شاید حیران ہوں۔ انکا حق بنتا ہے کیونکہ متعہ کے بارے غلط اور عوامانہ ذہنیت بنائی گئی ہے۔ شاید لوگ اسے مخفی، ناجائز اور غیر قانونی شادی تصور کرتے ہیں، یعنی ایک لفظ میں کہا جائے تو اسے جو زنا کے مشابہ خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہے۔

ہاں ان دو نکاحوں کے درمیان میاں بیوی کے حقوق کے لحاظ سے کچھ فرق ہے۔ اس نکاح میں عقد دائم کی نسبت آپس کے تعہد اور ذمہ داریاں بہت کم ہیں۔ کیونکہ اس نکاح کا مقصد ہی سہولت اور قوانین کا بہت سخت نہ ہونا ہے۔ من جملہ:

۱۔ بیوی عقد متعہ میں نفقہ اور وراثت کی حقدار نہیں بنتی۔ البتہ بعض فقہاء قائل ہیں کہ یہ اس صورت میں ہے جب نکاح میں نفقہ اور وراثت کی شرط نہ لگائی جائے یعنی اگر نکاح میں یہ شرط رکھ دی ہے تو پھر اس شرط کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔

۲۔ اس نکاح میں عورت آزاد ہے کہ گھر سے باہر جا کر کام (ملازمت) کر سکتی ہے۔ اس کے لیئے شوہر کی اجازت شرط نہیں ہے جب تک یہ کام شوہر کے حقوق کو تلف نہ کرتا ہو۔ لیکن عقد دائم میں بیوی کیلئے شوہر کی رضایت کے بغیر باہر ملازمت کرنا جائز نہیں ہے۔

۳۔ اس نکاح میں مرد پر واجب نہیں ہے کہ رات کو اپنی بیوی کے پاس

مذکورہ احکام میں غور وفکر کرنے سے بہت سے سوالات، غیر منصفانہ قضاوت، شبہات اور تہمتوں کا جواب روشن ہو جائیگا۔ اور اسلام کے اس حکیمانہ اور مقدس حکم کے بارے میں پائی گئی غلط ذہنیت خود بخود ختم ہو جائیگی۔ اور اس گفتگو سے یہ بات بھی بالکل واضح و روشن ہو جاتی ہے کہ اس نکاح موقت کا زنا اور دیگر عفت کے منافی اعمال کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جو لوگ ان دونوں کا آپس میں قیاس کرتے ہیں وہ یقیناً ناآگاہ ہیں اور انہیں نکاح متعہ کی حقیقت اور شرائط کے بارے میں بالکل معلومات نہیں ہیں۔

سوء استفادہ: ہمیشہ مثبت امور سے سوء استفادہ بدزبان لوگوں کی زبان کھولتا اور بہانہ گروں کو بہانہ فراہم کرتا ہے تاکہ اسے بہانہ بنا کر مثبت امور کے خلاف کام کریں اور اپنا زہر اگلیں۔

نکاح متعہ بھی اس قسم کی بحثوں کا ایک روشن مصداق ہے۔

انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض ہوس پرستوں نے اس نکاح متعہ کو جو کہ حقیقت میں ضروریات کی گرہ کھولنے اور اجتماعی مشکلات کو حل کرنے کے لیئے تشریع کیا گیا تھا، بازیچہ بنا دیا ہے اور بے اطلاع لوگوں کے سامنے اس کا چہرہ مسخ کر کے مخالفین کو بہانہ فراہم کیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ حکیمانہ حکم تنقید کا نشانہ بن گیا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسا حکم ہے، جس سے ایک دن ضرور سوء استفادہ نہ کیا گیا ہو اور وہ کونسا نفیس سرمایہ ہے، جس سے نااہل غلط طور پر بہرہ مند نہ ہوئے ہوں؟!

اگر لوگوں نے ایک دن جھوٹ اور دھوکے سے قرآن مجید کو نیزوں پر بلند کیا تاکہ اپنی ظالم حکومت کا دفاع کر سکیں تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم قرآن مجید کو چھوڑ دیں؟!

یا اگر ایک دن منافقین نے مسجد ضرار بنا دی، جس کے ویران کرنے اور جلانے کا حکم خود پیغمبر اسلامؐ نے صادر فرمایا تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم مسجد سے کنارہ کشی اختیار کر لیں؟

بہر حال ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ بعض نادان لوگوں نے اسلامی حکم سے سوء استفادہ کیا ہے، لیکن چند بے نمازیوں کی وجہ سے مسجد کو تالا نہیں لگایا جاسکتا ہے۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہوس پرستوں کے لیئے راستہ بند کیا جائے اور اس نکاح متعہ کے لیے صحیح راہ حل نکالا جائے۔

بالخصوص ہمارے زمانے میں یہ کام منظم اور دقیق راہ حل کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ بعض شائستہ اور ماہر شخصیات اور اہل خبرہ لوگ اس مسئلہ کے لیئے ایک کارآمد اور قابل اجراء قانون نامہ لکھ کر شیاطین کے ہاتھ قطع کر دیں اور اس حکیمانہ حکم کے خوبصورت چہرہ کو آشکار کر دیں۔ تاکہ دو گروہوں کے لیئے راستہ بند ہو جائے۔ ایک ہوس پرست گروہ اور دوسرا تنقید کرنے والا کینہ توز ٹولہ۔

نکاح متعہ، قرآن وسنت اور اجماع کی روشنی میں:

قرآن مجید میں نکاح موقت کو "متعہ" کے عنوان کے ساتھ سورۂ نساء کی آیت نمبر ۲۴ میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً"، پس جن خواتین کے ساتھ تم متعہ کرو ان کا حق مہر انہیں ادا کرو"

اور اہم نکتہ یہ ہے کہ رسول خداؐ سے نقل شدہ بہت سی احادیث میں "متعہ" کا لفظ، نکاح موقت کے لیئے استعمال کیا گیا ہے (جیسا کہ آئندہ ابحاث میں یہ روایات قارئین کی نظروں سے گزریں گی) اس کے علاوہ فقہاء اسلام کی کتابوں میں چاہے وہ شیعہ ہوں یا سنی ہر جگہ نکاح

موقت کو "متعہ" کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ بس اس بات کا انکار مسلمات کا انکار شمار ہوگا (فقہاء کے بعض کلمات بھی آئندہ اوراق میں آپکی خدمت میں پیش کیے جائینگے)

اس کے باوجود بعض لوگوں کا اصرار ہے کہ اس آیت میں "استمتاع" کا لفظ "لذت اٹھانے" اور "ہمبستری کرنے" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور کہتے ہیں اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جس وقت تم بیویوں سے جنسی استفادہ کرو تو انکا حق مہر ادا کیا کرو۔ اس بات میں دو واضح اعتراض ہیں:

اولاً: حق مہر کی ادائیگی کا وجوب، عقد اور نکاح پر موقوف ہے۔ یعنی نکاح ہونے کے فوراً بعد عورت اپنے پورے حق مہر کی ادائیگی کا مطالبہ کرسکتی ہے چاہے ہمبستری نہ ہی کی ہو حتیٰ خوش فعلی بھی واقع نہ ہوئی ہو (ہاں اگر ہمبستری سے پہلے طلاق واقع ہوجائے تو طلاق کے بعد حق مہر آدھا ہوجاتا ہے) (غور فرمایئے)۔

ثانیاً: جیسا کہ کہا ہے کہ متعہ کی اصطلاح شریعت کی عرف میں، شیعہ اور سنی فقہاء کے کلمات اور احادیث کی زبان میں "نکاح موقت" کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ اس بات کی ادلہ مفصل طور پر آپ کے سامنے پیش کی جائیں گی۔

مشہور مفسّر مرحوم طبرسی، تفسیر مجمع البیان میں اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں وضاحت فرماتے ہیں کہ اس آیت کے بارے میں دو نظریے ہیں، ۱۔ ایک اُن لوگوں کا نظریہ ہے جو استمتاع کو "لذت اٹھانے" کے معنی میں تفسیر کرتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے بعض اصحاب یا تابعین وغیرہ کو اس نظریہ کے قائلین کے طور پر پیش کیا ہے ۲۔ دوسرا اُن لوگوں کا نظریہ ہے جو قائل ہیں کہ یہ آیت عقد متعہ اور نکاح موقت کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اسے انہوں نے ابن عباس وسدی وابن مسعود اور تابعین کے ایک گروہ کا نظریہ قرار دیا ہے۔

اس کے بعد وہ تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دوسرا نظریہ واضح ہے کیونکہ متعہ اور استمتاع کا لفظ شریعت کی عرف میں نکاح موقت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کے علاوہ دوسری دلیل یہ ہے کہ حق مہر کا وجوب لذت اٹھانے کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔(۱)

قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں: کہ جمہور کے عقیدہ کے مطابق اس آیت سے مراد وہی نکاح موقت ہے جو صدر اسلام میں رائج تھا۔(۲)

اس کے علاوہ سیوطی نے تفسیر درالمنثور میں اور ابوحیان، ابن کثیر اور ثعالبی نے اپنی تفاسیر میں اس معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ مسئلہ تمام علمائے اسلام (شیعہ، سنّی) کے نزدیک مسلّم ہے کہ نکاح موقت (متعہ) پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں موجود تھا۔ لیکن فقہائے اہلسنت کی ایک بڑی جماعت قائل ہے کہ یہ حکم بعد میں منسوخ ہوگیا تھا۔ البتہ کس زمانے میں منسوخ ہوا؟ اس بارے میں انکا شدید اختلاف ہے۔ اور یہ بات توجہ طلب ہے۔

من جملہ مشہور عالم "جناب نووی" صحیح مسلم کی شرح میں یوں اقوال نقل کرتے ہیں:

۱۔ بعض کہتے ہیں کہ (متعہ کو) غزوہ خیبر میں پہلے حلال کیا گیا پھر حرام کردیا گیا۔

۲۔ صرف عمرۃ القضاء میں حلال تھا۔

۳۔ فتح مکہ کے دن پہلے حلال اور پھر حرام کردیا گیا۔

۴۔ غزوہ تبوک (سنہ ۹ ہجری ق) میں حرام کیا گیا۔

۵۔ صرف جنگ اوطاس (سنہ ۸ ہجری ق) میں حلال کیا گیا۔

(۱) تفسیر مجمع البیان، جلد ۳، ص ۶۰۔
(۲) تفسیر قرطبی، جلد ۵، ص ۱۲۰، و فتح القدیر، جلد ۱، ص ۴۴۹۔

۶۔ حجۃ الوداع (سنہ ۱۰ ہجری ق) میں حلال کیا گیا۔(۱)

دلچسپ یہ ہے کہ اس بارے میں متضاد روایات نقل کی گئی ہیں بالخصوص جنگ خیبر میں اس کی تحریم اور حجۃ الوداع میں اس کی تحریم والی روایات مشہور ہیں۔ بعض اہلسنت فقہاء نے ان دو احادیث کو جمع کرنے کے لیئے بہت کوشش کی ہے لیکن کوئی مناسب راہ حل پیش نہیں کرسکے ہیں۔(۲)

اور اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ جناب شافعی کا یہ جملہ ہے: وہ فرماتے ہیں "لا اَعْلَمُ شیئاً اَحَلَّ اللّٰہ ثم حرّمَہ ثم اَحلّہ، ثم حرّمَہ الا المُتعۃ" مجھے متعہ کے علاوہ کسی اور چیز کا علم نہیں ہے کہ اسے پہلے اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہو پھر حرام کر دیا ہو پھر دوبارہ حلال کیا ہو اور اس کے بعد پھر حرام کر دیا ہو!!"(۳)

دوسری طرف سے ابن حجر، سہیلی سے نقل کرتے ہیں کہ غزوۂ خیبر کے دن متعہ کی تحریم ایسی چیز ہے جسے راویوں اور ارباب تاریخ میں سے کسی نے نقل نہیں کیا۔(۴)

۷: ایک اور قول یہ ہے کہ متعہ رسولخداؐ کے زمانے میں حلال تھا، بعد میں حضرت عمر نے اس سے منع کیا ہے۔ جیسا کہ اہلسنت کی معتبر ترین کتاب صحیح مسلم میں یوں آیا ہے "ابن ابی نضرۃ" کہتے ہیں میں جناب جابر ابن عبداللہ انصاری کی خدمت میں تھا، وہ کہنے لگے کہ ابن زبیر اور ابن عباس کے درمیان عورتوں کے ساتھ متعہ اور متعۂ حج (حج تمتع یعنی عمرہ اور حج کے

---

۱) شرح صحیح مسلم جلد ۹ ص ۱۹۱۔
۲) ایضاً۔
۳) المغنی ابن قدامہ، جلد ۷ ص ۵۷۲۔
۴) فتح الباری، جلد ۹ ص ۱۳۸۔

درمیان فاصلہ ہو) کے مسئلہ میں اختلاف تھا (میں نے کہا آپ کی کیا نظر ہے؟) کہنے لگے: ہم نے ہر دو مسئلوں پر رسولخداؐ کے زمانے میں عمل کیا ہے یہانتک کہ حضرت عمر نے ہر دو سے منع کر دیا اس کے بعد ہم نے پرہیز کیا!"(۱)

اس صریح نص کے بعد اور وہ بھی صحیح مسلم جیسی کتاب میں، کیا اب بھی کہا جا سکتا ہے کہ متعہ رسولخداؐ کے دور میں حرام ہو گیا تھا۔

کس نے متعہ کو حرام کیا؟

جس بات کو ہم نے اوپر جناب جابر ابن عبداللہ انصاری سے نقل کیا ہے وہ اس مشہور حدیث کی طرف اشارہ ہے جسے اہلسنت کے بہت سے محدثین، مفسرین اور فقہاء نے اپنی کتابوں میں خلیفۂ دوم سے نقل کیا ہے۔ حدیث کا متن یوں ہے:

"متعتان کانتا مشروعتین فی عهد رسول اللّٰه
و انا انهی عنهما: متعة الحج و متعه النساء"

دو قسم کے متعے، رسولخداؐ کے زمانے میں جائز اور حلال تھے میں اُن دونوں سے منع کرتا ہوں ایک حج متعہ اور دوسرا متعہ النساء (نکاح موقت)

بعض کتابوں میں یہ حدیث اس جملہ کے اضافہ کے ساتھ نقل ہوئی ہے "و اُعاقبُ علیهما" اور میں ان دونوں پر سزا دوں گا۔

متعۂ حج سے یہ مُراد ہے کہ حاجی پہلے عمرہ بجالائے اور احرام کھول دے اس کے بعد حج کے دنوں میں دوبارہ حج کا احرام باندھ لے۔

---

۱) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۵۹ حدیث ۳۲۰۷، دار الفکر بیروت۔

یہ حدیث اُن مشہور احادیث میں سے ہے جو تھوڑے، بہت اختلاف کے ساتھ حضرت عمر سے نقل ہوئی ہے کہ انہوں نے منبر سے یہ بات لوگوں کے سامنے بیان کی۔ ہم ذیل میں اہلسنت کی حدیث، فقہ اور تفسیر کی کتب میں سے اس حدیث کے سات حوالے ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ مسند احمد، جلد ۳ صفحہ ۳۲۵۔

۲۔ سنن بیہقی، جلد ۷، صفحہ ۲۰۶۔

۳۔ المبسوط سرخسی، جلد ۴ صفحہ ۲۷۔

۴۔ المغنی ابن قدامہ، جلد ۷، صفحہ ۵۷۱۔

۵۔ محلی ابن حزم، جلد ۷، صفحہ ۱۰۷۔

۶۔ کنز العمال، جلد ۱۶ صفحہ ۵۲۱۔

۷۔ تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۱۰ صفحہ ۵۲۔

یہ حدیث متعدد مسائل سے پردہ اٹھاتی ہے۔

الف) خلیفہ اول کے دور میں متعہ کا حلال ہونا:

متعہ (نکاح موقت) رسول اکرمؐ کی طول حیات میں بلکہ خلیفہ اول کے دور حکومت میں بھی حلال تھا اور خلیفہ دوم نے بعد میں اس سے منع کیا!۔

ب) اجتہاد در مقابل نص:

خلیفہ اپنی اتنی اتھارٹی سمجھتے تھے کہ پیغمبر اکرمؐ کی صریح نص کے مقابلے میں نیا قانون اور اسلامی حکم جعل کریں حالانکہ قرآن مجید واضح طور پر ارشاد فرماتا ہے کہ:

"وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا"(۱)

"پیغمبر جو کچھ آپ کو دیں اسے لے لیں اور جس چیز سے منع کریں اس سے پرہیز کریں"

کیا پیغمبر اکرمؐ کے علاوہ کسی اور کو احکام الٰہی میں تصرف کرنے کا حق حاصل ہے؟

کیا کوئی بھی شخص یوں کہہ سکتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے ایسا کیا لیکن میں یوں کرتا ہوں؟

کیا پیغمبر اکرمؐ کی صریح نص کے مقابلے میں کہ جو وحی سے اخذ شدہ ہے اجتہاد کرنا جائز ہے؟

حقیقت تو یہ ہے کہ رسولخداؐ کے احکام کو اتنی لاپرواہی کے ساتھ رد کرنا واقعاً تعجب آور ہے اور اس سے بڑھ کر اگر نص کے مقابل میں اجتہاد کا دروازہ کھول دیا جائے تو کیا ضمانت ہے کہ دوسرے لوگ ایسا کام نہیں کریں گے؟ کیا اجتہاد صرف ایک آدمی کے ساتھ مخصوص تھا اور دوسرے لوگ مجتہد نہیں ہو سکتے ہیں؟

یہ بہت حساس مسئلہ ہے کیونکہ نص کے مقابلے میں اجتہاد کا دروازہ کھل جانے کے بعد احکام الٰہی میں سے کچھ بھی محفوظ نہیں رہے گا؛ اور اسلام کے جاودانہ احکام میں عجیب ہرج پیدا ہو جائیگا اور اس طرح تمام اسلامی احکام خطرے میں پڑ جائیں گے۔

حضرت عمر کی مخالفت کا سبب:

کیوں حضرت عمر، ان دو احکام الٰہی کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے؟ حج تمتع کے

۱) سورہ حشر آیہ ۷۔

بارے میں انکا خیال یہ تھا جو مسلمان حج کے لیے آتے ہیں انہیں حج اور عمرہ ختم کرنے کے بعد احرام کھولنے چاہئیں اور بعد میں مثلاً اپنی بیویوں کے ساتھ آمیزش کرنی چاہیے۔ اور یہ کہ عمرہ تمتع انجام دینے کے بعد حاجی چند دن کے لیے احرام کھول دے اور آزاد ہو جائے یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے اور روح حج کے ساتھ سازگار نہیں ہے!

یہ خیال درست نہیں ہے، کیونکہ حج اور عمرہ دو علیحدہ عمل ہیں اور ممکن ہے ان دو اعمال کے درمیان ایک ماہ سے زیادہ فاصلہ ہو۔ مسلمان ماہ شوال یا ذی قعدہ میں مکہ مشرف ہوتے ہیں اور عمرہ بجالاتے ہیں اس کے بعد آٹھ ذی الحجہ تک آزاد ہوتے ہیں پھر حج کے موسم میں دوبارہ احرام باندھتے ہیں اور عرفات چلے جاتے ہیں اس بات پر کیا اشکال ہے جسکی وجہ سے حضرت عمر نے اپنے سخت ردّ عمل کا مظاہرہ فرمایا اور بہر حال متعہ اور نکاح موقت کے بارے میں (بعض لوگوں کے عقیدہ کے مطابق) انکا خیال یہ تھا کہ اگر متعہ جائز ہو تو پھر نکاح اور زنا کے درمیان شناخت مشکل ہو جائیگی۔ کیونکہ اس صورت میں اگر کسی مرد اور عورت کو اکٹھا دیکھا جائے تو وہ کہہ دیں گے کہ ہم نے آپس میں متعہ کیا ہوا ہے! اس طرح زنا کی شرح بڑھ جائیگی!

یہ خیال تو اس پہلے خیال سے زیادہ بوگس ہے، چونکہ اتفاقاً مسئلہ الٹ ہے کیونکہ عقد متعہ سے منع کرنا، زنا اور بے عفتی کے بڑھاؤ کا موجب ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا ہے کہ بہت سے ایسے جوان جو دائمی ازدواج کی قدرت نہیں رکھتے ہیں یا ایسے لوگ جو اپنی بیویوں سے دور ہیں اور زنا یا نکاح موقت کے علاوہ ان کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے واضح سی بات ہے کہ انہیں صحیح راستے اور عقد موقت سے روکنا گناہوں اور بے عفتی کی وادی میں دھکیلنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی مشہور حدیث میں یوں نقل ہوا ہے کہ اگر

جناب عمر متعہ سے منع نہ کرتے تو سوائے شقی اور بد بخت کے کوئی بھی انسان دنیا میں زنا سے آلودہ نہ ہوتا" لو لا انّ عمر نهى النّاس عن المتعة ما زنىٰ الّاشقى"(۱)

متعہ کی تحریم کے بعد لوگوں کا ردّ عمل:

مذکورہ بالا روایت سے کہ جسے اہلسنت کے بہت سے محدثین، مفسرین اور فقہاء نے نقل کیا ہے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ متعہ کی تحریم حضرت عمر کے زمانے میں تھی نہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں، اس کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات جو انہی کتب میں نقل ہوئی ہیں اس بات کی تائید کرتی ہیں۔ نمونے کے طور پر چند ایک روایات ذکر کرتے ہیں:

۱۔ مشہور محدث جناب ترمذی نقل کرتے ہیں کہ اہل شام کے ایک آدمی نے جناب عبداللہ بن عمر سے متعہ نساء کے بارے میں سوال کیا، انہوں نے کہا۔ حلال ہے۔ سائل نے کہا آپ کے والد حضرت عمر نے اس سے منع کیا ہے۔ جناب عبداللہ بن عمر نے کہا:

"ارأیت ان کان ابی قد نھیٰ عنھا و قد سنّھا رسول اللّٰہ، انترک السنّۃ و نتبعُ قول ابی؟"(۲)

---

۱) تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۱۰ ص ۵۰۔

۲) یہ حدیث آجکل کی شائع شدہ صحیح ترمذی میں اس طرح نہیں ہے بلکہ اس میں متعۃ النساء کی جگہ متعۃ الحج آیا ہے۔ لیکن جناب زین الدین المعروف شہید ثانی نے کہ جو دسویں صدی کے علماء میں سے تھے کتاب شرح لمعہ میں اور مشہور عالم ابن طاؤوس نے کہ جو ساتویں صدی کے علماء میں سے تھے کتاب الطرائف میں اسی حدیث کو متعۃ النساء کے ساتھ نقل کیا ہے ایسا لگتا ہے کہ صحیح ترمذی کے قدیمی نسخوں میں یہ حدیث اسی طرح تھی لیکن بعد میں اس میں تبدیلی کردی گئی ہے (اس قسم کی مثالیں بہت زیادہ ہیں)۔

اگر میرے والد ایک چیز سے منع کریں لیکن رسولخدا نے اسے سنت قرار دیا ہو تو کیا ہم آنحضرت کی سنت کو ترک کر کے اپنے باپ کی بات پر عمل کریں گے؟!

ایک اور حدیث (صحیح مسلم) میں جناب جابر ابن عبداللہ انصاری سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم رسولخدا کے زمانے میں تھوڑی سی کھجوروں یا آٹے کے حق مہر پر چند دن کے لیئے متعہ کرلیا کرتے تھے اور یہ سنت حضرت ابوبکر کے زمانے میں بھی جاری تھی یہاں تک کہ حضرت عمر نے "عمرو بن حریث" والے واقعہ کی وجہ سے اس کام سے منع کردیا۔(۱)

۳۔ اسی کتاب میں ایک اور حدیث میں یوں آیا ہے کہ ابن عباس اور ابن زبیر کا متعۃ النساء اور متعۃ الحج کے بارے میں اختلاف ہوگیا (اور انہوں نے جناب جابر ابن عبداللہ انصاری کو ثالث بنایا) تو جابر نے کہا ہم نے ان دونوں پر رسولخدا کے زمانے میں عمل کیا ہے، اس کے بعد حضرت عمر نے منع کیا اور ہم نے پرہیز کیا!(۲)

۴۔ ابن عباس کہ جنہیں "حبر الامۃ" (امت کے عالم) کا لقب دیا گیا ہے، رسولخدا کے زمانے میں حکم متعہ کے منسوخ نہ ہونے کے قائل تھے اس بات کی دلیل انکے اور جناب عبداللہ بن زبیر کے درمیان ہونے والی بحث ہے جسے صحیح مسلم میں نقل کیا گیا ہے: عبداللہ بن زبیر نے مکہ میں رہائش رکھی ہوئی تھی ایک دن (کچھ لوگوں کے سامنے جن میں جناب ابن عباس بھی تھے) کہنے لگے بعض ایسے لوگ کہ خداوند نے انکے دل کی آنکھوں کو انکی ظاہری آنکھوں کی طرح اندھا کردیا ہے، وہ فتویٰ دیتے ہیں کہ متعہ جائز ہے۔ انکا مقصد ابن عباس کو سنانا تھا جو کہ اس زمانے میں نابینا ہوچکے تھے۔ ابن عباس نے جب یہ بات سُنی تو کہنے لگے

۱) صحیح مسلم، جلد ۲، ص ۱۳۱۔
۲) صحیح مسلم، جلد ۲، ص ۱۳۱۔

کہ تو ایک بے وقوف اور نادان آدمی ہے، مجھے اپنی جان کی قسم ہم نے رسولخدا کے زمانے میں اس سنت پر عمل کیا ہے۔ ابن زبیر نے (رسولخدا کے نام سے لاپرواہی کرتے ہوئے) کہا: تو آزما کر دیکھ لے، خدا کی قسم اگر تو نے اس پر عمل کیا تو تجھے سنگسار کردوں گا۔(۱)

یعنی منطقی بات کا جواب زور اور دھمکی کے ساتھ دیا!

احتمالاً یہ بات اس زمانے کی ہے جب عبداللہ بن زبیر نے مکہ میں حکومت حاصل کرلی تھی اسی لیے تو اس نے ابن عباس جیسے دانشمند اور عالم کے مقابلے میں ایسی بات کرنے کی جسارت کی۔ حالانکہ ابن عباس، سن کے اعتبار سے اس کے باپ کے برابر تھے اور علم کے اعتبار سے تو یا انکے ساتھ قابل قیاس ہی نہیں تھا۔ بالفرض اگر علم میں انکے برابر بھی ہوتا تو اس قسم کی دھمکی کا حق اسے نہیں پہنچتا تھا۔ کیونکہ اس قسم کے احکام میں اگر کوئی اپنے فتویٰ پر عمل کرے اور بالفرض اس کا فتویٰ غلط بھی ہو تب بھی "وطی بالشبہہ" شمار ہوگی اور معلوم ہے کہ وطی بالشبہہ میں حد جاری نہیں ہوتی ہے لہٰذا سنگسار کرنے کی دھمکی دینا ایک بے معنی اور جاہلانہ سی بات ہے۔

البتہ اس قسم کی بے ہودہ دھمکی عبداللہ بن زبیر جیسے ایک نادان اور گستاخ جوان کی طرف سے بعید نہیں ہے ا دلچسپ بات یہ ہے کہ راغب نے کتاب محاضرات ...... میں نقل کیا ہے کہ عبداللہ ابن زبیر نے سرزنش کے لہجے میں ابن عباس کو کہا کہ تو کیوں "متعہ" کو حلال سمجھتا ہے۔ ابن عباس نے کہا جا کر اپنی ماں سے پوچھ لے! وہ اپنی ماں کے پاس آیا۔ ماں نے اس سے کہا "ماولدتک الا فی المتعہ" تو اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب میں تیرے باپ کے متعہ میں

۱) صحیح مسلم، جلد ۴، ص ۵۹، حدیث ۳۳۰۷، چاپ دار الفکر۔

تھی!''(۱)

۵۔ مسند احمد میں ''ابن حصین'' سے نقل کیا گیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں متعہ کی آیت نازل ہوئی اور اس پر ہم نے عمل کیا اور اس کو نسخ کرنے والی آیت نازل نہیں ہوئی یہاں تک کہ رسولخدا کی رحلت ہوگئی۔(۲)

یہ ان روایات کے بعض نمونے ہیں جو صراحت کے ساتھ حکم متعہ کے منسوخ نہ ہونے کو بیان کرتے ہیں۔

ان روایات کے مقابلے میں کچھ روایات نقل کی گئی ہیں جو کہتی ہیں کہ یہ حکم رسولخداؐ کے زمانے میں منسوخ ہو چکا تھا۔ اے کاش یہ روایات آپس میں متفق ہوتیں اور ایک ہی زمانے کی نشاندہی کرتیں لیکن افسوس یہ ہے کہ ہر روایت نے دوسری روایت سے جداگانہ زمانے کو بیان کیا ہے۔

۱۔ ان روایات میں سے بعض میں ذکر ہوا ہے کہ متعہ کی تحریم کا حکم جنگ خیبر والے دن (۷ ہجری میں) صادر ہوا۔(۳)

۲۔ بعض دوسری روایات میں آیا ہے کہ رسولخداؐ نے عام الفتح (فتح مکہ والے سال ۸ ہجری) میں مکہ کے اندر متعہ کی اجازت فرمائی اور کچھ عرصہ کے بعد اسی سال منع فرمادیا۔(۴)

۳۔ بعض دیگر روایات میں آیا ہے کہ غزوہ اوطاس میں (فتح مکہ کے بعد) ہوازن کی

۱) محاضرات، جلد۲، ص۲۱۴؛ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، جلد۲۰، ص۱۳۰۔
۲) مسند احمد، جلد۴، ص۴۳۶۔
۳) درّ المنثور، جلد۲، ص۴۸۶۔
۴) صحیح مسلم، جلد۴، ص۱۳۳۔

سرزمین پر (مکہ کے نزدیک) تین دن کے لیے اجازت فرمائی اس کے بعد منع فرمادیا(۱)

اگر کوئی مختلف اقوال کی تحقیق انجام دے تو معلوم ہوگا کہ اس مسئلہ میں اختلاف اس سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ اہلسنت کے مشہور فقیہ (جناب نووی) نے صحیح مسلم کی شرح میں اس مسئلہ کے بارے میں چھ قول نقل کیے ہیں اور ہر قول کسی نہ کسی روایت کے ساتھ سازگار ہے:

۱۔ متعہ جنگ خیبر میں حلال کیا گیا اور پھر (اس کے چند دن بعد) تحریم ہوگیا
۲۔ عمرۃ القضاء میں حلال ہوا (پھر حرام ہوگیا)
۳۔ فتح مکہ کے دن حلال ہوا اس کے بعد حرام ہوگیا
۴۔ رسولخداؐ نے اسے غزوۂ تبوک کے دن حرام کیا
۵۔ جنگ ہوازن میں (سرزمین اوطاس پر) حلال کیا گیا
۶۔ حجۃ الوداع میں پیغمبر اکرمؐ کی زندگی کے آخری سال میں اسے حلال قرار دیا گیا ہے(۲)

ان سب اقوال سے تعجب آور امام شافعی کا کلام ہے وہ کہتے ہیں ''مجھے متعہ کے علاوہ کوئی چیز ایسی نہیں ملی جسے اللہ تعالیٰ نے پہلے حلال کیا ہو پھر حرام کردیا ہو اس کے بعد دوبارہ حلال کیا ہو اور پھر حرام کردیا ہو''(۳)

ہر محقق ان متضاد روایات کا مشاہدہ کرکے اس بات کا اطمینان حاصل کرلیتا ہے کہ یہ روایات جعلی اور ایک سیاسی منصوبہ بندی کے تحت جعل کی گئی ہیں۔

بہترین راہ حل

حقیقت یہ ہے کہ ان مختلف اور متضاد اقوال کو دیکھ کو ہر انسان اس مسئلہ میں تحقیق وجستجو کی

۱) مصدر سابق، ص۱۳۱۔
۲) شرح صحیح مسلم از نووی، جلد۹، ص۱۹۱۔
۳) المغنی ابن قدامہ، جلد۷، ص۵۷۲۔

طرف مائل ہوتا اور سوچتا ہے کہ ایسا کونسا واقعہ رونما ہوا ہے کہ مسئلہ میں اسقدر متضاد و متناقض روایات بیان کی گئی ہیں اور ہر محدث یا فقیہ نے کیوں اپنا جداگانہ راستہ اختیار کیا ہے؟

ان متضاد روایات کے درمیان کس طرح جمع کیا جاسکتا ہے؟

کیا یہ سب اختلاف اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس مقام پر کوئی نازک سیاسی مسئلہ درپیش تھا جس نے حدیث گھڑنے والوں کو اس بات پر ابھارا کہ روایات جعل کریں اور اصحاب رسولؐ کے نام سے سوء استفادہ کرتے ہوئے ان روایات کو انکی طرف نسبت دیں کہ انہوں نے آنحضرتؐ سے اس طرح نقل کیا ہے۔ اور وہ سیاسی مسئلہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ خلیفہ دوم نے کہا تھا" دو چیزیں رسولخداؐ کے زمانے میں حلال تھیں اور میں انہیں حرام کررہا ہوں ان میں سے ایک "متعہ النساء ہے"۔ اس بات کا ایک عجیب منفی اثر تھا کیونکہ اگر امت کے افراد یا خلفاء، اسلام کے احکام کو اس صراحت کے ساتھ تبدیل کردیں تو پھر یہ کام صرف خلیفہ ثانی کے ساتھ مخصوص نہ رہتا بلکہ دوسروں کو بھی یہ حق مل جاتا کہ رسولخداؐ کی نص کے مقابلے میں اجتہاد کریں۔ اور اس صورت میں احکام اسلام یعنی واجبات اور محرمات کے درمیان ہرج و مرج پیدا ہوجاتا اور زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کے دامن میں کچھ باقی نہ رہتا۔

اس منفی اثر کو ختم کرنے کے لیے ایک گروہ نے یہ کام شروع کیا کہ کہنے لگے: ان دو احکام کی حرمت خود رسولخداؐ کے زمانے میں واقع ہوئی تھی۔ ہر ایک نے نئی حدیث گھڑلی اور اسے اصحاب رسولؐ کی طرف نسبت دے دی۔ کیونکہ کوئی بھی حدیث واقعیت نہیں رکھتی تھی اس لیے ایک دوسرے سے متضاد بن گئیں!!

ورنہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی احادیث ایک دوسرے کے مخالف ہوں حتی کہ بعض فقہاء کو انکے درمیان جمع کرنے کے لیے کہنا پڑا کہ متعہ ایک زمانے میں مباح تھا پھر حرام ہوگیا پھر مباح

ہوگیا پھر حرام ہوگیا! کیا احکام الٰہی کھیل ہیں کہ جو ہر روز تبدیل ہوتے رہیں۔

ان سب باتوں سے قطع نظر رسولخداؐ کے زمانے میں متعہ کا مباح ہونا حتما ایک ضرورت کی وجہ سے تھا اور وہ ضرورت دوسرے زمانوں میں بھی موجود ہے۔ بالخصوص ہمارے زمانے میں مغربی ممالک کی طرف طولانی سفر کرنے والے بعض جوانوں کے لیے یہ ضرورت شدت کے ساتھ موجود ہے پس متعہ کیوں حرام ہو؟

اس زمانے میں اسلامی معاشرے میں جذبات بھڑکانے کے عوامل اتنے زیادہ نہیں تھے بے پردہ عورتیں، فلمیں، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، ڈش، فساد والی محفلیں اور فاسد لٹریچر وغیرہ جو سب کچھ آج کے زمانے میں بہت سے جوانوں کے دامن گیر ہوتے ہیں اس زمانے میں نہیں تھے۔ اُس زمانے میں متعہ کو ایک احتیاج اور ضرورت کے عنوان سے جائز قرار دیا گیا اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے اس سے منع کردیا گیا ہے؟ کیا یہ بات قابل قبول ہے؟

ان سب ادلہ سے چشم پوشی کرتے ہوئے فرض کرلیتے ہیں کہ بہت سے فقہائے اسلام اس کو حرام شمار کرتے ہیں اور فقہاء کا ایک گروہ اس کو جائز سمجھتا ہے۔ اور یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ پس اس صورت میں یہ سزاوار نہیں ہے کہ حلال کے طرفدار لوگ اسے حرام سمجھنے والوں پر احکام دین کی پابندی نہ کرنے کی تہمت لگائیں۔ اسی طرح اسکی حرمت کے قائل افراد کیلئے یہ سزاوار نہیں کہ اسے مباح سمجھنے والوں پر معاذ اللہ زنا کے طرفدار ہونے کی تہمت لگائیں۔ اگر ایسا کریں تو قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کے حضور کیا جواب دیں گے؟ پس پتہ چلتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہ ایک اجتہادی اختلاف ہے۔

جناب فخر رازی اس قسم کے مسائل میں ایک خاص تعصب رکھنے کے باوجود اپنی تفسیر میں

٦

زمین پر سجدہ

فرماتے ہیں کہ "ذھب السواد الاعظم من الأمة الیٰ انّھا صارت منسوخة و قال السواد منھم أنّھا بقیت کما کانت" امت کی اکثریت قائل ہے کہ یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے لیکن ایک گروہ قائل ہے کہ یہ حکم اسی طرح باقی ہے"(۱) یعنی یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔

ہم اس جگہ نکاح موقت کی بحث کو تمام کرتے ہیں۔ اور سب لوگوں سے امید کرتے ہیں کہ تہمتیں لگانے اور بغیر علم کے قضاوت کرنے کی بجائے ایک بار پھر اس مسئلہ پر تحقیق اور اس کے بعد قضاوت کریں۔ یقیناً انہیں اطمینان ہو جائیگا کہ متعہ آج بھی ایک حکم الٰہی ہے اور شرائط کی پابندی کرتے ہوئے یہ آج بھی بہت سی مشکلات کو حل کرتا ہے۔

---

۱) تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۱۰، ص ۴۹۔

عبادات میں سجدہ کی اہمیت:

اسلام کی نظر میں سجدہ، اللہ تعالیٰ کی سب سے اہم یا اہم ترین عبادات میں سے ایک ہے۔ اور جیسا کہ احادیث میں بیان کیا گیا ہے، کہ انسان سجدہ کی حالت میں دیگر تمام حالات کی نسبت سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہوتا ہے۔ تمام بزرگان دین بالخصوص رسول اکرمؐ اور اہلبیتؑ بہت طولانی سجدے کیا کرتے تھے۔ خدا کی بارگاہ میں طولانی سجدے انسان کی روح اور جان کی نشو ونما کرتے ہیں۔ اور یہ اس لم یزل کی بارگاہ میں خضوع اور عبودیت کی سب سے بڑی علامت شمار ہوتے ہیں۔ اسی لیے نماز کی ہر رکعت میں دو سجدے بجالانے کا حکم دیا گیا ہے۔

اسی طرح سجدہ شکر اور قرآن مجید کی تلاوت کے دوران مستحب اور واجب سجدے بھی اسی سجدہ کا واضح ترین مصداق شمار ہوتے ہیں۔

انسان سجدہ کی حالت میں سوائے خدا کے ہر چیز کو بھول جاتا ہے اور اپنے آپ کو اس کے بہت نزدیک پاتا ہے اور گویا وہ اپنے آپ کو بساط قرب پر پاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سیر وسلوک وعرفان کے اساتید اور اخلاق کے معلم حضرات، سجدہ کے مسئلہ پر انتہائی تاکید فرماتے ہیں۔

مذکورہ بالا مطالب اس مشہور حدیث پر ایک روشن دلیل ہیں کہ انسان کا کوئی عمل بھی شیطان کو اتنا پریشان نہیں کرتا جتنا سجدہ اسے پریشان کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ" جناب ختمی مرتبت نے اپنے ایک صحابی کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اگر چاہتے ہو کہ قیامت کے دن میرے ساتھ محشور ہو تو خداوند قہار کے حضور طولانی سجدے انجام دیا کرو"

و اذا اردت ان یحشرک اللہ معی یوم القیامۃ
فاطل السجود بین یدی اللہ الواحد القھار"(۱)

غیر خدا کے لیے سجدہ کرنا جائز نہیں ہے:

ہمارا عقیدہ ہے کہ اس واحد و یکتا پروردگار کے سوا کسی کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ سجدہ انتہائی عاجزی اور خضوع کی علامت اور پرستش کا روشن مصداق ہے اور پرستش و عبودیت صرف ذات خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔

قرآن مجید کی اس آیت' وللہ یسجد من فی السموات و الارض" (۲) میں کلمہ "اللہ" کو مقدم کیا گیا ہے اور یہ تقدیم حصر پر دلالت کر رہی ہے یعنی زمین اور آسمان کی ہر چیز صرف اور صرف اللہ تعالی کو سجدہ کرتی ہے!

اسی طرح سورۂ اعراف کی ۲۰۶ نمبر آیت " و لہ یسجدون" بھی اس بات پر بہترین دلیل ہے کہ سجدہ صرف اللہ تعالی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔

---

۱) سفینۃ البحار، مادۂ سجدہ۔

۲) سورۂ رعد، آیہ ۱۵۔

حقیقت میں سجدہ خضوع کا آخری درجہ ہے اور یہ درجہ خداوند عالم کے ساتھ مخصوص ہے۔ لہٰذا کسی اور شخص یا چیز کے لیے سجدہ کرنا گویا خداوند عالم کے برابر قرار دینا ہے اور یہ درست نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک توحید کے معانی میں سے ایک معنی "توحید در عبادت" ہے یعنی پرستش اور عبادت صرف اللہ تعالی کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کے بغیر توحید کامل نہیں ہوتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں: غیر خدا کی عبادت کرنا شرک کی ایک قسم ہے اور سجدہ عبادت شمار ہوتا ہے۔ اس لیے غیر خدا کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔

اور جو سجدہ ملائکہ نے حضرت آدم کو کیا تھا (اور اسکا قرآن مجید میں کئی مقامات پر تذکرہ ہے) مفسرین کے بقول یا تو یہ حضرت آدمؑ کی تعظیم، تکریم اور احترام کا سجدہ تھا نہ عبادت کا سجدہ، بلکہ اس سجدہ سے ملائکہ کی مراد یہ تھی کہ چونکہ یہ سجدہ اللہ تعالی کے حکم کی تعمیل ہے لہٰذا اس ذات حق کی عبودیت ہے۔ اور یا یہ شکرِ خدا کا سجدہ تھا۔ اسی طرح جو سجدہ حضرت یعقوبؑ اور انکے بیوی بچوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے کیا تھا اور اسے قرآن مجید نے "خرّوا له سجّداً" اور سب انکے سامنے سجدہ میں گر پڑے" کے الفاظ کے ساتھ یاد کیا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالی کے سامنے سجدۂ شکر تھا۔ یا ایک قسم کی تعظیم، تکریم اور احترام کے معنی میں سجدہ تھا۔

اور قابل توجہ یہ ہے کہ "وسائل الشیعہ" کہ جو ہماری کتب حدیث کا ایک مصدر شمار ہوتی ہے، میں سجدۂ نماز کے ابواب میں ایک مکمل باب "عدم جواز السجود بغیر اللہ" کے عنوان سے ذکر ہوا ہے اور اس میں پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ معصومین علیہم السلام سے سات احادیث نقل کی گئی ہیں کہ غیر خدا کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔(۱)

---

۱) وسائل الشیعہ، جلد ۴، ص ۹۸۳۔

اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین فرما لیجیے کیونکہ آئندہ اسی گفتگو سے ہم نتیجہ اخذ کریں گے۔

کس چیز پر سجدہ کرنا چاہیے:

مکتب اہلبیت کے پیروکاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زمین کے علاوہ کسی چیز پر سجدہ نہیں ہوسکتا ہے، ہاں البتہ جو چیزیں زمین سے اگتی ہیں اور کھانے و پہننے کے کام نہیں آتیں جیسے درختوں کے پتے اور لکڑی وغیرہ اسی طرح حصیر و بوریا وغیرہ۔ ان پر سجدہ کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ علماء اہلسنت عام طور پر معتقد ہیں کہ ہر چیز پر سجدہ کیا جاسکتا ہے۔ ہاں ان میں سے صرف بعض علماء نے لباس کی آستین اور عمامہ و پگڑی کے گوشے کو مستثنیٰ کیا ہے کہ ان پر سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔

اس مسئلہ میں مکتب اہلبیت والوں کی دلیل، رسولخداؐ اور آئمہ اطہارؑ سے نقل ہونے والی احادیث اور اصحاب کا عمل ہے۔ ان محکم ادلہ کی وجہ سے وہ اس عقیدہ پر اصرار کرتے ہیں اور اس لیے مسجد الحرام اور مسجد نبویؐ میں اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ قالین وغیرہ پر سجدہ نہ کریں بلکہ پتھر پر سجدہ کریں اور کبھی حصیر اور مصلی وغیرہ اپنے ساتھ لاتے ہیں اور اس پر سجدہ کرتے ہیں۔

ایران، عراق اور دیگر شیعہ نشین ممالک کی تمام مساجد میں چونکہ قالین بچھے ہوئے ہیں، اس لیے خاک سے ''سجدہ گاہ'' بنا کر اسے قالین پر رکھتے ہیں اور اس پر سجدہ کرتے ہیں تاکہ پیشانی کو کہ جو تمام اعضاء میں اشرف و افضل ہے اللہ تعالیٰ کے حضور، خاک پر رکھا جاسکے۔ اور اس ذات احدیت کی بارگاہ میں انتہائی تواضع و انکساری کا مظاہرہ کیا جاسکے۔ کبھی یہ ''سجدہ گاہ''

شہداء کی تربت سے بنائی جاتی ہے تاکہ راہ خدا میں ان کی جانثاری کی یاد تازہ ہو اور نماز میں زیادہ سے زیادہ حضور قلب حاصل ہو سکے۔ اور پھر شہدائے کربلا کی تربت کو دوسری ہر قسم کی خاک پر ترجیح دی جاتی ہے لیکن شیعہ ہمیشہ اس تربت یا دوسری خاک کے پابند نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے مساجد کے صحنوں میں لگے ہوئے پتھروں (جیسے مسجد الحرام اور مسجد نبوی کے صحن والے سنگ مرمر) پر بھی باآسانی سجدہ کر لیتے ہیں (غور کیجئے)

بہرحال مکتب اہلبیت کے پاس زمین پر سجدہ کے وجوب کے بارے میں بہت سی ادلہ ہیں من جملہ پیغمبر اکرمؐ کی احادیث، صحابہ کی سیرت جو آئندہ بحث میں بیان ہوگی اور آئمہ اطہار سے نقل ہونے والی روایات کہ جنھیں ہم عنقریب نقل کریں گے۔

ہمیں تعجب یہ ہے کہ بعض اہلسنت برادران ہمارے اس فتویٰ کے مقابلے میں کیوں اسقدر شدید ردّعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں اور کبھی اسے بدعت سے تعبیر کرتے ہیں حتیٰ بعض اوقات اسے کفر اور بت پرستی شمار کرتے ہیں۔

اگر ہم خود ان کی اپنی کتابوں سے ثابت کردیں کہ رسولخداؐ اور انکے اصحاب، زمین پر سجدہ کرتے تھے تو کیا پھر بھی یہ عمل بدعت ہوگا؟

اگر ہم ثابت کردیں کہ آنحضرتؐ کے بعض اصحاب جیسے جناب جابر ابن عبداللہ انصاری وغیرہ جب شدید گرمی کی وجہ سے پتھر اور ریت گرم ہو جاتی تھی تو وہ کچھ مقدار ریت کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں تبدیل کرتے تھے تاکہ کچھ ٹھنڈی ہو جائے اور اس پر سجدہ کیا جاسکے''(۱) تو کیا اس صورت میں جناب جابر ابن عبداللہ کو بت پرست یا بدعت گزار شمار کریں گے؟!

۱) مسند احمد، ج ۳، ص ۳۲۷ و سنن بیہقی جلد ا، ص ۴۳۹۔

پس جو شخص حصیر پر سجدہ کرتا ہے یا ترجیح دیتا ہے کہ مسجد الحرام یا مسجد نبویؐ کے فرش پر سجدہ کرے تو کیا وہ حصیر کی پرستش کرتا ہے یا مسجد کے فرش کی پوجا کرتا ہے؟!

کیا ضروری نہیں ہے کہ یہ برادران اس موضوع پر مشتمل ہماری ہزاروں فقہی کتابوں میں سے کم از کم ایک کتاب کا مطالعہ کریں تا کہ انہیں پتہ چل جائے کہ ان ناروا نسبتوں میں ذرہ برابر بھی حقیقت کی جھلک نہیں ہے؟

آیا کسی پر بدعت یا کفر و بت پرستی کی تہمت لگانا کم گناہ ہے اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے آسانی سے معاف کر دیگا؟

اس بات کو جاننے کے لیے کہ کیوں شیعہ زمین پر سجدہ کرتے ہیں، امام صادق علیہ السلام کی اس حدیث کی طرف توجہ کافی ہے۔ ہشام بن حکم نے کہ جو امام کے خصوصی اصحاب میں سے تھے سوال کیا کہ کس چیز پر سجدہ کیا جا سکتا ہے اور کس چیز پر سجدہ کرنا جائز نہیں ہے؟ امام نے جواب میں فرمایا" السجود لا یجوز الا علی الارض او ما انبتت الارض الا ما اکل أو لبس " کسی چیز پر سجدہ کرنا جائز نہیں ہے مگر صرف زمین پر یا ان چیزوں پر جو زمین سے اگتی ہیں اور کھانے اور پہننے کے کام نہیں آتیں ہشام کہتا ہے میں نے عرض کی آپؑ پر قربان ہو جاؤں اس کی حکمت کیا ہے؟

آپؑ نے فرمایا:"لانّ السّجود هو الخضوع لِلّٰهِ عزّ و جل فلا ینبغی أن یکون علیٰ ما یُؤکَلُ و یُلبس لانّ أبناء الدّنیا عبید ما یاکلون و یلبسون و الساجد فی سُجوده فی عبادة الله فلا ینبغی أن یَضَعَ جَبهَتَهُ فی سُجوده علیٰ معبود أبناء الدّنیا الذین اغترّوا بِغرورها " کیونکہ سجدہ اللہ تعالیٰ کے سامنے خضوع اور انکساری ہے اس لیے مناسب نہیں ہے کہ انسان کھانے اور پہننے کی چیزوں پر سجدہ کرے۔

کیونکہ دنیا پرست لوگ کھانے اور پہننے والی چیزوں کے بندے ہوتے ہیں۔ جبکہ وہ شخص جو سجدہ کر رہا ہے سجدہ کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہے پس مناسب نہیں ہے کہ انسان اپنی پیشانی کو سجدہ کی حالت میں ایسی چیزوں پر رکھے جو دنیا پرستوں کے معبود ہیں اور انکی زرق و برق کے وہ فریفتہ ہیں۔

اس کے بعد امام علیہ السلام نے اضافہ فرمایا:" و السجودُ علی الارضِ افضلُ لانه ابلغ للتواضع و الخُضوع لِلّٰه عزّ و جلّ " کہ زمین پر سجدہ کرنا افضل ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حضور بہتر طور پر خضوع و تواضع اور انکساری کی علامت ہے۔(۱)

۴۔ مسئلہ کی ادلّہ:

اب ہم اس مسئلہ کی ادلّہ بیان کرتے ہیں۔ سب سے پہلے رسول اکرمؐ کے کلام سے شروع کرتے ہیں:

الف) زمین پر سجدہ کے سلسلہ میں معروف حدیث نبوی:

اس حدیث کو شیعہ و اہل سنت نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جُعلت لی الارض مسجداً و طهوراً " کہ زمین میرے لیے محل سجدہ اور طہارت (تیمم) قرار دی گئی ہے"(۲)

بعض علماء نے یہ خیال کیا ہے کہ حدیث کا معنی یہ ہے کہ پوری روئے زمین اللہ کی عبادت کا مقام ہے۔ پس عبادت کا انجام دینا کسی معیّن مقام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے جیسا کہ یہود

۱) علل الشرائع، جلد ۲، ص ۳۴۱۔
۲) صحیح بخاری جلد ۱ ص ۹۱ و سنن بیہقی، جلد ۲، ص ۴۳۳ (اور بہت سی دوسری [illegible]

و نصاریٰ گمان کرتے تھے کہ عبادت کو حتماً کلیساؤں اور عبادت خانوں میں انجام دینا چاہیے"۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تفسیر حدیث کے حقیقی معنی کے ساتھ سازگار نہیں ہے کیونکہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا "زمین طہور بھی ہے اور مسجد بھی" اور ہم جانتے ہیں کہ جو چیز طہور ہے اور جس پر تیمم کیا جاسکتا ہے وہ زمین کی خاک اور پتھر ہیں پس سجدہ گاہ کو بھی وہی خاک اور پتھر ہونا چاہیے۔

اگر پیغمبر اکرمؐ اس معنیٰ کو بیان کرنا چاہتے کہ جسکا بعض اہلسنت کے علماء نے استفادہ کیا ہے تو یوں کہنا چاہیے تھا کہ "جعلت لی الارض مسجداً و ترابها طهوراً" پوری سرزمین کو میرے لیے مسجد قرار دیا گیا اور اس کی خاک کو طہارت یعنی تیمم کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے" لیکن آپؐ نے یوں نہیں فرمایا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں مسجد سے مراد جائے سجدہ ہے لہٰذا سجدہ گاہ کو بھی اسی چیز سے ہونا چاہیے جس پر تیمم ہوسکتا ہے۔

پس اگر شیعہ زمین پر سجدہ کرنے کے پابند اور قالین وغیرہ پر سجدہ کو جائز نہیں سمجھتے تو یہ کوئی غلط کام نہیں کرتے بلکہ رسولخداؐ کے دستور پر عمل کرتے ہیں۔

ب) سیرت پیغمبرؐ:

متعدد روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم بھی زمین پر سجدہ کرتے تھے، کپڑے یا قالین وغیرہ پر سجدہ نہیں کرتے تھے۔

ابو ہریرہ کی ایک حدیث میں یوں نقل ہوا ہے وہ کہتا ہے "سجد رسول الله ﷺ فی یوم مطیر حتیٰ انّی لانظر الیٰ اثر ذلک فی جبهته و ارنبته" میں نے رسولخداؐ کو ایک

بارانی دن زمین پر سجدہ کرتے ہوئے دیکھا۔ سجدہ کے آثار آپ کی پیشانی اور ناک پر نمایاں تھے۔(۱)

اگر سجدہ کپڑے یا دری وغیرہ پر جائز ہوتا تو ضرورت نہیں تھی کہ آنحضرتؐ بارش کے دن بھی زمین پر سجدہ کریں۔

حضرت عائشہ نیز فرماتی ہیں "ما رایت رسول الله متقیاً وجهه بشیء" میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آنحضرتؐ (سجدہ کے وقت) اپنی پیشانی کسی چیز سے ڈھانپ لیتے ہوں"(۲)

ابن حجر اس حدیث کی تشریح میں کہتے ہیں: کہ یہ حدیث اس بات کیطرف اشارہ ہے کہ سجدہ میں اصل یہ ہے کہ پیشانی زمین پر لگے لیکن اگر قدرت نہ ہو تو پھر یہ واجب نہیں ہے۔(۳)

ایک دوسری روایت میں جناب میمونہ (رسول اکرمؐ کی ایک دوسری زوجہ) سے یوں نقل ہوا ہے کہ "و رسول الله يصلي على الخمرة فيسجد" پیغمبر اکرم حصیر (چٹائی) پر نماز پڑھتے اور اس پر سجدہ کرتے تھے۔

اہلسنت کی معروف کتب میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ "خمرہ" پر نماز پڑھتے تھے (خمرہ اس چھوٹے سے مصلیٰ یا حصیر کو کہتے ہیں جو کھجور کے پتوں سے بنایا جاتا تھا) تعجب یہ ہے کہ اگر شیعہ اسی طرح عمل کریں اور نماز پڑھتے وقت کوئی مصلیٰ بچھالیں تو ان پر بعض متعصب لوگوں کی طرف سے بدعت کی تہمت لگائی جاتی ہے۔ اور غصے کے ساتھ انہیں

۱) مجمع الزوائد، جلد ۲، ص ۱۲۶۔
۲) مصنف ابن ابی شیبہ، جلد ۱، ص ۳۹۷۔
۳) فتح الباری، جلد ۱، ص ۴۰۴۔

دیکھا جاتا ہے۔

حالانکہ یہ احادیث بتاتی ہیں کہ یہ کام پیغمبر اکرمؐ کی سنت ہے۔

کتنے افسوس کا مقام ہے کہ سنت کو بدعت شمار کیا جائے!

مجھے نہیں بھولتا کہ ایک مرتبہ حج کے موقع پر مدینہ میں، میں مسجد نبویؐ میں ایک چھوٹی سی چٹائی پر نماز پڑھنا چاہتا تھا تو ایک متعصب وہابی عالم دین آیا اور اس نے بڑے غصے کے ساتھ چٹائی اٹھا کر کونے میں پھینک دی گویا وہ بھی اس سنت کو بدعت سمجھتا تھا۔

ج) صحابہ اور تابعین کی سیرت

اس بحث میں دلچسپ موضوع یہ ہے کہ اگر ہم اصحاب اور انکے بعد آنے والے افراد (یعنی تابعین) کے حالات کا غور سے مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے وہ بھی زمین پر سجدہ کرتے تھے مثال کے طور پر:

۱۔ جابر ابن عبداللہ انصاری فرماتے ہیں" کنتُ اُصلّی مع النبی الظهر فآخذ قبضة من الحصی فاجعلها فی کفی ثم احولها الیٰ الكف الأخریٰ حتیٰ تبرد ثم اضعها لجبینی حتیٰ اسجد علیها من شدة الحرّ" میں پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ نماز ظہر پڑھتا تھا۔ شدید گرمی کی وجہ سے کچھ سنگریزے ہاتھ میں لے لیتا تھا اور انہیں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں تبدیل کرتا رہتا تھا تاکہ وہ کچھ ٹھنڈے ہو جائیں اور ان پر سجدہ کر سکوں یہ کام گرمی کی شدت کی وجہ سے تھا"(۱)

---

۱) مسند احمد، جلد ۳، ص ۳۲۷، سنن بیہقی، جلد ۱، ص ۴۳۹۔

اس حدیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ اصحاب پیغمبرؐ زمین پر سجدہ کرنے کے پابند تھے، حتیٰ کہ شدید گرمی میں بھی اس کام کے لیے راہ حل تلاش کرتے تھے۔ اگر یہ کام ضروری نہ ہوتا تو اتنی زحمت کی ضرورت نہیں تھی۔

۲۔ انس بن مالک کہتے ہیں" کنّا مع رسول اللهؐ فی شدة الحرّ فیاخذ احدنا الحصباء فی یده فاذا برد وضعه و سجد علیه" ہم شدید گرمی میں رسولخداؐ کے ساتھ تھے ہم میں سے بعض لوگ کچھ سنگریزے ہاتھ میں لے لیتے تھے تاکہ ٹھنڈے ہو جائیں پھر انہیں زمین پر رکھ کر ان کے اوپر سجدہ کرتے تھے۔(۱)

یہ تعبیر بھی بتاتی ہے کہ یہ کام اصحاب کے درمیان رائج تھا۔

۳۔ ابوعبیدہ نقل کرتے ہیں" انّ ابن مسعود لا یسجد. او قال لا یصلّی. الا علی الارض" کہ جناب عبداللہ ابن مسعود صرف زمین پر سجدہ کرتے تھے یا یوں کہا کہ صرف زمین پر نماز پڑھتے تھے۔(۲)

اگر زمین سے قالین یا دری وغیرہ مراد ہوتی تو کہنے کی ضرورت نہیں تھی اس سے پتہ چلتا ہے کہ زمین سے وہی خاک: ریت اور سنگریزے وغیرہ مراد ہیں۔

۴۔ عبداللہ ابن مسعود کے ایک دوست مسروق بن اجدع کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ" کان لا یرخص فی السجود علیٰ غیر الارض حتیٰ فی السفینة وكان یحمل فی السفینة شیئاً یسجد علیه" وہ سوائے زمین کے کسی شے پر سجدہ کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے حتیٰ اگر کشتی میں سوار ہوتا ہوتا تو کوئی چیز اپنے ساتھ کشتی میں رکھ لیتے تھے جس،

---

۱) السنن الکبریٰ بیہقی، جلد ۲، ص ۱۰۶۔

۲) مصنف ابن ابی شیبہ، جلد ۱، ص ۳۹۷۔

پر سجدہ کرتے"(۱)

۵۔ جناب علی ابن عبداللہ ابن عباس نے "رزین" کو خط میں لکھا "ابعث الیّ بلوح من احجار المروة علیه اسجُد" کہ مروہ کے پتھروں میں سے ایک صاف سا پتھر میرے لیے بھیجنا تا کہ میں اس پر سجدہ کر سکوں"(۲)

۶۔ کتاب فتح الباری (شرح صحیح بخاری) میں نقل ہوا ہے کہ "کان عمر ابن عبدالعزیز لا یکتفی بالخمرة بل یضع علیها التراب و یسجد علیه" عمر ابن عبدالعزیز نماز کے لیے صرف چٹائی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اس پر مٹی رکھ لیتے اور اس پر سجدہ کرتے تھے۔(۳)

ان تمام روایات سے کیا سمجھ میں آتا ہے؟ کیا یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ اصحاب اور اُن کے بعد آنے والے افراد کی (ابتدائی صدیوں میں) یہی سیرت تھی کہ زمین پر یعنی خاک، پتھر، ریت اور سنگریزوں وغیرہ پر سجدہ کرتے تھے۔

اگر آج ہمارے زمانے میں کچھ مسلمان اس سنت کو زندہ رکھنا چاہیں تو کیا اسے بدعت کے عنوان سے یاد کیا جائے؟!

کیا فقہائے اہلسنت کو نہیں چاہیے کہ قدم آگے بڑھاتے ہوئے اس سنت نبویؐ کو زندہ کریں، وہی کام جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انتہائی خضوع، انکساری اور عاجزی سے حکایت کرتا ہے اور سجدہ کی حقیقت کے ساتھ زیادہ سازگار ہے۔ (ایسے دن کی امید کے ساتھ)۔

---

۱) طبقات الکبریٰ، ابن سعد، جلد ۶، ص ۵۳۔

۲) اخبار مکہ ازرقی، جلد ۲، ص ۱۵۱۔

۳) فتح الباری، جلد ۱، ص ۴۱۰۔

۷

جمع بین صلاتین

بیان مسئلہ:

نماز، خالق اور مخلوق کے درمیان ایک اہم ترین رابطہ اور تربیت کے ایک اعلیٰ ترین لائحہ عمل کا نام ہے۔ نماز خود سازی اور تزکیہ نفوس کا ایک بہترین وسیلہ اور فحشاء و منکر سے روکنے والے عمل کا نام ہے۔ نماز قرب الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے۔

اور با جماعت نماز مسلمانوں کی قوت و قدرت اور انکی صفوف میں وحدت کا مظہر اور اسلامی معاشرے کے لیے باافتخار زندگی کا باعث ہے۔

نماز اصولی طور پر دن رات میں پانچ مرتبہ انجام دی جاتی ہے جس سے انسان کے دل و جان ہمیشہ فیض الٰہی کے چشمہ زلال سے دھلتے رہتے ہیں۔

نماز کو رسول خداؐ نے اپنی آنکھوں کا نور قرار دیا اور اس کے لیے " قرة عینی فی الصلاة " (۱) ارشاد فرمایا اور اسے مؤمن کی معراج شمار کرتے ہوئے۔ "الصلوٰۃ معراج المؤمن" (۲) کی صدا بلند کی اور اسے متقین کے لیے قرب الٰہی کے وسیلہ کے عنوان سے

---

۱) مکارم الاخلاق، ص ۴۶۱۔

۲) اگرچہ یہ جملہ کتب احادیث میں نہیں ملا لیکن اسقدر مشہور ہے کہ علامہ مجلسی نے اپنے بیانات کے دوران اس جملے سے استشہاد فرمایا ہے (بحار الانوار، جلد ۷۹، ص ۲۴۸، ۳۰۳)۔

متعارف کرایا "الصلاۃ قربان کلی تقی" (۱)

اس مقام پر موضوع سخن یہ ہے کہ کیا پانچ نمازوں کا پانچ اوقات میں علیحدہ علیحدہ انجام دینا ایک واجبی حکم ہے؟ اور اس کے بغیر نماز باطل ہو جاتی ہے (جس طرح وقت سے پہلے نماز پڑھ لینا، اس کے باطل ہونے کا سبب بنتا ہے) یا اسے تین وقتوں میں انجام دیا جاسکتا ہے؟

(یعنی ظہر وعصر کی نماز اور مغرب وعشاء کی نماز کو جمع کر کے ادا کیا جائے) علمائے شیعہ۔ مکتب اہلبیت کی پیروی کرتے ہوئے۔ عموماً اس بات پر اتفاق نظر رکھتے ہیں کہ پانچ نمازوں کو تین وقتوں میں انجام دینا جائز ہے اگرچہ افضل وبہتر یہ ہے کہ نماز پنجگانہ کو پانچ وقتوں میں انجام دیا جائے۔

لیکن علمائے اہلسنت کی اکثریت۔ سوائے چند ایک کے۔ اس بات کی قائل ہے کہ نماز پنجگانہ کو علیحدہ علیحدہ پانچ اوقات میں انجام دینا واجب ہے (صرف عرفہ کے دن میدان عرفات میں ظہر وعصر کی نمازوں کو اکٹھا پڑھا جاسکتا ہے اور عید قربان کی رات مشعر الحرام میں مغرب وعشاء والی نماز کو اکٹھا بجالایا جاسکتا ہے البتہ بہت سے علماء نے سفر اور بارش کے اوقات میں کہ جب نماز جماعت کے لیے مسجد میں رفت وآمد مشکل ہو دو نمازوں کو اکٹھا پڑھنے کی اجازت دی ہے)۔

شیعہ فقہاء کی نظر میں۔ جیسا کہ بیان ہوا۔ نماز پنجگانہ کے جدا جدا پڑھنے کی فضیلت پر تاکید کے ساتھ۔ نمازوں کو تین اوقات میں بجالانے کی اجازت اور رخصت کو ایک عطیہ الٰہی شمار کیا جاتا ہے جسے امر نماز میں سہولت اور لوگوں کے لیے وسعت کی خاطر پیش کیا گیا ہے۔

۱) کافی جلد ۳، ص ۲۶۵، حدیث ۲۶۔

اور اس اجازت کو روح اسلام کے ساتھ سازگار سمجھا جاتا ہے کیونکہ اسلام ایک "شریعۃ سمحۃ و سہلۃ" (آسان وسہل) ہے۔

تجربے سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ نماز کے لیے پانچ وقتوں پر علیحدہ علیحدہ تاکید کبھی اس بات کا سبب بنتی ہے کہ اصل نماز بالکل فراموش ہو جائے اور بعض لوگ نماز کو ترک کر دیں۔

اسلامی معاشروں میں پانچ اوقات پر اصرار کے آثار:

اسلام نے کیوں عرفہ کے دن ظہر وعصر کی نماز اور مشعر الحرام میں مغرب اور عشاء کی نمازوں کو جمع کرنے کی اجازت دی ہے؟

کیوں بہت سے اہلسنت فقہاء، روایات نبوی کی روشنی میں سفر کے دوران اور بارش کے اوقات میں دو نمازوں کے اکٹھا پڑھنے کو جائز سمجھتے ہیں؟ یقیناً امت کی سہولت کی خاطر یہ احکام نازل ہوئے ہیں۔

یہ تسہیل تقاضا کرتی ہے کہ دیگر مشکلات میں بھی چاہے سابقہ زمانے میں ہوں یا اس دور میں۔ نماز کے جمع کرنے کی اجازت دینی چاہیے۔

ہمارے زمانے میں لوگوں کی زندگی تبدیل ہو چکی ہے۔ کارخانوں میں بہت سے مزدوروں، دفتروں میں بہت سے ملازمین اور کلاسوں میں بہت سے طالب علموں کو پانچ وقت نماز کی فرصت نہیں ملتی ہے یعنی انکے لیے کام کرنا کافی دشوار اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

پس ان روایات کے مطابق جو پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہیں اور آئمہ طاہرین نے ان پر تاکید کی ہے اگر لوگوں کو دو نمازوں کو اکٹھا پڑھنے کی اجاز

انکے کام میں سہولت حاصل ہوگی۔ اور نماز پڑھنے والوں کی تعداد بڑھ جائیگی۔

اگر ایسا نہ کیا جائے تو ترک نماز میں اضافہ ہوگا اور تارک صلوٰۃ لوگوں کی تعداد بڑھتی جائیگی شاید یہی وجہ ہے کہ بہت سے اہلسنت کے جوان نماز کو چھوڑتے ہیں اور اہل تشیع میں تارکین نماز کی تعداد بہت کم ہے۔

انصاف یہ ہے کہ "بُعثتُ الیٰ الشریعة السمحة السهلة" (۱) اور رسولخداؐ سے نقل ہونے والی متعدد روایات کی روشنی میں لوگوں کو تین اوقات میں نماز پڑھنے کی اجازت دینی چاہیے اسی طرح فرادیٰ نماز کی بھی اجازت دینی چاہیے تا کہ زندگی کی مشکلات ترک نماز کا موجب نہ بنے۔ اگرچہ اسلام میں پانچ وقت نماز کی فضیلت پر تاکید ہوئی ہے اور وہ بھی جماعت کے ساتھ۔

دو نمازوں کو اکٹھا پڑھنے کے جواز پر روایات:

اہلسنت کی معروف کتب جیسے صحیح مسلم، صحیح بخاری، سنن ترمذی، مؤطاء مالک، مسند احمد، سنن نسائی، مصنف عبدالرزاق اور دیگر مشہور کتابوں میں تقریباً تیس ۳۰ روایات نقل کی گئی ہیں جن میں بغیر سفر اور مطر (بارش) کے، بغیر خوف اور ضرر کے، نماز ظہر وعصر یا نماز مغرب وعشاء کے اکٹھا پڑھنے کو نقل کیا گیا ہے۔ ان میں سے اکثر روایات کو ان پانچ مشہور اصحاب نے نقل کیا ہے۔

۱۔ ابن عباس ۲، جابر ابن عبداللہ انصاری، ۳۔ ابوایوب انصاری، ۴۔ عبداللہ ابن عمر، ۵۔ ابوہریرہ، ان میں سے بعض کو ہم قارئین محترم کے لیئے نقل کرتے ہیں۔

۱) مجھے ایک سہل اور آسان شریعت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے (ترجمہ)۔

۱۔ ابوزبیر نے سعید بن جبیر سے، انہوں نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ "صلّی رسول اللّٰہ الظهر و العصر جمیعاً بالمدینة فی غیر خوف و لا سفر" رسولخداؐ نے مدینہ میں بغیر کسی خوف اور سفر کے نماز ظہر اور عصر کو اکٹھا انجام دیا۔

ابوالزبیر کہتے ہیں میں نے سعید ابن جبیر سے پوچھا کہ پیغمبر اکرمؐ نے ایسا کیوں کیا؟ تو وہ کہنے لگے کہ یہی سوال میں نے ابن عباس سے کیا تھا تو انہوں نے جواب میں کہا تھا " اراد ان لا یُحرج احداً من امّته" "آنخضرتؐ کا مقصد یہ تھا کہ میری امت کا کوئی مسلمان بھی زحمت میں نہ پڑے"(۱)

۲۔ ایک اور حدیث میں ابن عباس سے نقل کیا گیا ہے" جمع رسول اللّٰہ بین الظهر و العصر و المغرب و العشاء فی المدینة فی غیر خوف و لا مطر" "پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ میں بغیر کسی خوف اور بارش کے نماز ظہر وعصر اور نماز مغرب وعشاء کو اکٹھا انجام دیا"۔

حدیث کے ذیل میں آیا ہے کہ جب ابن عباس سے سوال کیا گیا کہ پیغمبر اکرمؐ کا اس جمع بین صلاتین سے کیا مقصد تھا تو انہوں نے جواب میں کہا" اراد ان لا یحرج" آنخضرتؐ کا یہ مقصد تھا کہ کوئی مسلمان بھی زحمت ومشقت سے دوچار نہ ہو۔ (۲)

۳۔ عبداللہ ابن شقیق کہتے ہیں:

"خطبنا ابن عباس یوماً بعد العصر حتی غربت الشمس و بدت النجوم و جعل الناس یقولون الصلاة، الصلاة! قال فجاءه رجل من بنی تمیم لا

۱) صحیح مسلم، جلد ۲، ص ۱۵۱۔
۲) صحیح مسلم، جلد ۲، ص ۱۵۲۔

يفتر و لا ينثني: الصلوة، الصلوة فقال ابن عباس اتعلمني بالسنة لا ام لک ثم قال: رايت رسول الله جمع بين الظهر و العصر و المغرب و العشاء قال عبد الله بن شقيق: فحاک في صدري من ذلک شيء فاتيت ابا هريره فسألته، فصدق مقالته" (۱)

کہ ایک دن ابن عباس نے نماز عصر کے بعد خطبہ پڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا اور ستارے ظاہر ہوگئے، لوگوں نے نماز، نماز کی آوازیں لگانا شروع کردیں۔ ایسے میں بنوتمیم قبیلہ کا ایک آدمی آیا وہ مسلسل نماز، نماز کی صدائیں بلند کررہا تھا اس پر ابن عباس نے کہا، تو مجھے سنت رسول سکھانا چاہتا ہے اے بے حسب ونسب! میں نے دیکھا ہے کہ رسولؐ خدا نے نماز ظہر وعصر کو، اسی طرح نماز مغرب وعشاء کو اکٹھا پڑھا ہے عبداللہ بن شقیق کہتا ہے میرے دل میں شک سا پیدا ہوگیا، میں ابوہریرہ کے پاس آیا اور اُن سے یہی بات دریافت کی انہوں نے ابن عباس کے کلام کی تصدیق کی۔

۴۔ جابر ابن زید لکھتے ہیں کہ ابن عباس نے کہا کہ: "صلى النبي (ص) سبعاً جميعاً و ثمانياً جميعاً" پیغمبر اکرمؐ نے سات رکعتیں اور آٹھ رکعتیں اکٹھی پڑھیں" (مغرب اور عشاء کی نماز اسی طرح ظہر اور عصر کی نماز کے اکٹھا پڑھنے کی طرف اشارہ ہے) (۲)

۱) سابقہ مدرک۔
۲) صحیح بخاری، جلد ۱، ص ۱۴۰ (باب وقت المغرب)۔

۵۔ سعید بن جبیر، ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ:

"جمع رسول الله (صلى الله عليه و آله و سلم) بين الظهر و العصر و بين المغرب و العشاء بالمدينة من غير خوف و لا مطر قال: فقيل لابن عباس: ما اراد بذلک؟ قال اراد ان لا يحرج امته" (۱)

"پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ میں بغیر دشمن کے خوف اور بارش کے، ظہر وعصر کی نماز، اسی طرح مغرب وعشاء کی نمازوں کو اکٹھا پڑھا، ابن عباس سے پوچھا گیا کہ آنحضرتؐ کا اس کام سے کیا مقصد تھا؟ تو انہوں نے کہا آپؐ چاہتے تھے کہ انکی امت مشقت میں نہ پڑے"

۶۔ امام احمد ابن حنبل نے بھی اسی کے مشابہ حدیث اپنی کتاب مسند میں ابن عباس سے نقل کی ہے۔ (۲)

۷۔ امام مالک نے اپنی کتاب "مؤطا" میں مدینہ کا تذکرہ کیے بغیر ابن عباس سے یہ حدیث نقل کی ہے:

"صلى رسول الله الظهر و العصر جميعاً و المغرب و العشاء جميعاً في غير خوف و لا مطر" (۳)

۱) سنن ترمذی، جلد ۱، ص ۱۲۱ حدیث ۱۸۷۔
۲) مسند احمد، جلد ۱، ص ۲۲۳۔
۳) موطا مالک، جلد ۱، ص ۱۴۴۔

"رسول خداؐ نے ظہر و عصر کی نماز کو اسی طرح مغرب و عشاء کی نماز کو اکٹھا پڑھا حالانکہ نہ تو دشمن کا خوف تھا اور نہ ہی بارش کا خطرہ"

۸: "مصنف عبدالرزاق" نامی کتاب میں جناب عبداللہ ابن عمر سے نقل کیا گیا ہے کہ:

"جمع لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم مقیماً غیر مسافر بین الظہر و العصر فقال رجل لأبن عمر: لم تری النبی فعل ذلک؟ قال لأن لا یحرج اُمّتہ ان جمع رجل" (۱)

پیغمبر اکرمؐ نے بغیر سفر کے یعنی قیام کی حالت میں ظہر و عصر کی نمازوں کو اکٹھا پڑھایا، کسی نے ابن عمر سے پوچھا آپ کے خیال کے مطابق پیغمبر اکرمؐ نے یہ کام کیوں کیا؟ اس پر انہوں نے کہا آپؐ نے یہ کام اس لیے انجام دیا کہ اگر امت میں سے کوئی ان دو نمازوں کو اکٹھا پڑھ لے تو زحمت میں مبتلا نہ ہو (لوگ اس پر اعتراض نہ کریں)۔

۹۔ جابر ابن عبداللہ کہتے ہیں کہ:

"جمع رسول اللہ (ص) بین الظہر و العصر و المغرب و العشاء فی المدینۃ للرّخص من غیر خوف و لا علّۃ" (۲)

"رسول خداؐ نے مدینہ میں بغیر دشمن کے خوف اور بغیر کسی عذر کے ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازوں کو اکٹھا پڑھا تا کہ امت کے لیے اجازت اور رخصت شمار ہو۔

۱) مصنف عبدالرزاق، جلد ۲، ص ۵۵۶۔
۲) معانی الآثار، جلد ۱، ص ۱۶۱۔

۱۰۔ ابوہریرہ نیز نقل کرتے ہیں کہ:

"جمع رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم) بین الصلوتین فی المدینۃ من غیر خوف" (۱)

رسول خداؐ نے مدینہ میں بغیر دشمن کے خوف کے دو نمازوں کو اکٹھا پڑھا۔

۱۱۔ عبداللہ بن مسعود بھی نقل کرتے ہیں کہ:

"جمع رسول اللہ (ص) بین الاولیٰ و العصر و المغرب و العشاء فقیل لہ فقال: صنعتہ لئلا تکون اُمتی فی حرج" (۲)

رسول خداؐ نے مدینہ میں ظہر و عصر کی نماز، اسی طرح مغرب و عشاء کی نمازوں کو اکٹھا پڑھا۔ کسی نے آپؐ سے اس کے سبب کے بارے میں سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ کام میں نے اس لیے کیا ہے تا کہ میری امت مشقت میں نہ پڑے۔

اسی طرح اور بہت سی احادیث موجود ہیں جو اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

یہاں پر دو سوال پیش نظر ہیں:

۱۔ مذکورہ احادیث کا نتیجہ:

مذکورہ بالا تقریباً تمام احادیث میں "کہ جو اہلسنت کی مشہور اور درجۂ اول کی کتب میں ذکر ہوئی ہیں اور ان کی سند بعض بزرگ اصحاب تک پہنچتی ہے" دو نکات پر تاکید کی گئی ہے:

۱) مسند البزاز، جلد ۱، ص ۲۸۳۔
۲) المعجم الکبیر طبرانی، جلد ۱۰، ص ۲۱۹، حدیث ۱۰۵۲۵۔

ایک تو یہ کہ رسولخداؐ نے دو نمازوں کو اس حال میں اکٹھا انجام دیا کہ کسی قسم کی مشکل جیسے دشمن کا خوف، سفر، بارش وغیرہ، درپیش نہیں تھی۔

اور دوسرے یہ کہ آپ کا مقصد "امت کو رخصت دینا" اور "عسر و حرج سے نجات دلانا" تھا۔

آیا ان نکات کی روشنی میں سزاوار ہے کہ بعض لوگ اعتراض تراشی کریں اور یوں کہیں کہ یہ اکٹھا پڑھنا اضطراری موارد میں تھا؟ ہم کیوں حقائق سے چشم پوشی کریں، اور اپنے تمام نظریات کو رسولخداؐ کے صریح فرامین پر ترجیح دیں؟!

خدا اور اس کے رسولؐ نے اجازت دی ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ امت کے بعض متعصب لوگ اجازت نہیں دیتے! آخر کیوں؟!

یہ لوگ کیوں نہیں چاہتے ہیں کہ مسلمان جوان ہر حال میں اور ہر جگہ پر، اسلامی ممالک کے اندر اور باہر، یونیورسٹیوں، دفتروں اور کارخانوں میں اس اہم ترین اسلامی فریضہ (یعنی یومیہ نمازیوں) پر عمل کریں؟

ہمارا نظریہ ہے کہ اسلام قیامت تک ہر زمان اور ہر مکان کے لیے ہے۔

پیغمبر اکرمؐ یقیناً اپنی وسعت نظری کے ذریعہ تمام دنیا کے مسلمانوں اور تمام زمانوں اور صدیوں کے لوگوں کو مدنظر رکھے ہوئے تھے وہ جانتے تھے کہ اگر تمام لوگوں کو پانچ وقت میں نماز پڑھنے پر مقید کریں گے تو اس کے نتیجے میں بعض لوگ تارک الصلاۃ ہو جائیں گے (جیسا کہ ہم آجکل دیکھ رہے ہیں) اسی لیے انہوں نے اپنی امت پر احسان کیا اور کام کو آسان

کر دیا تا کہ سب لوگ ہر زمان و مکان میں آسانی کے ساتھ روزانہ کی نمازوں کو بجالا سکیں۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

"وما جعل علیکم فی الدین من حرج" (۱)

۲۔ قرآن مجید اور نماز کے تین اوقات:

اسی مسئلہ میں تعجب کی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کی دو آیات میں جب نماز کے اوقات کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہاں یومیہ نمازوں کے لیے صرف تین اوقات ذکر کیے گئے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ کیوں ان بھائیوں میں سے ایک گروہ پانچ اوقات کے وجوب پر اصرار کرتا ہے۔

پانچ اوقات میں نماز کی زیادہ فضیلت کے بارے میں کسی کو انکار نہیں ہے۔ ہمیں بھی اگر توفیق الٰہی شامل حال رہے تو پانچ اوقات میں نماز ادا کرتے ہیں۔

اختلاف صرف ان پانچ اوقات کے وجوب کے بارے میں ہے۔

۱۔ پہلی آیت سورہ ہود میں ہے: "واقم الصلوۃ طرفی النہار و زلفاً من اللیل" دن کے دو اطراف میں اور رات کے کچھ حصے میں نماز ادا کرو......" (۲)

"طرفی النہار" نماز صبح کی طرف جو دن کی ابتداء میں انجام دی جاتی ہے، اور نماز ظہر و عصر کی طرف اشارہ ہے کہ جن کا وقت سورج غروب ہونے تک باقی ہے۔ بالفاظ دیگر نماز ظہر و عصر کے وقت کا غروب آفتاب تک باقی رہنا اس آیت سے با آسانی استفادہ ہوتا ہے اور "زلفاً من اللیل" کہ جس میں لفظ "زلف" استعمال ہوا ہے جس کے بارے میں "مختار

---

۱) سورہ حج آیت ۷۸۔ اور اللہ نے تم پر دین کے مسئلے میں کوئی حرج اور مشقت نہیں رکھی۔

۲) سورہ ہود آیت ۱۱۴۔

"الصحاح" اور راغب نے کتاب المفردات میں لکھا ہے کہ یہ "زلــفة" کی جمع ہے اور اسے رات کے ابتدائی حصوں کے بارے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ "زلفاً من اللیل" مغرب اور عشاء کے وقت کی طرف اشارہ ہے۔

بنابراین اگر پیغمبر اکرم نمازوں کو عام طور پر پانچ وقتوں میں انجام دیتے تھے تو وہ یقیناً ان پانچ اوقات کی فضیلت کے اعتبار سے تھا کہ جس کے ہم سب معتقد ہیں ہم کیوں قرآن مجید کی آیت کے ظہور سے چشم پوشی کریں اور دوسری تاویلوں کو تلاش کریں؟!

۲۔ دوسری آیت سورہ اسراء میں ہے: "اقم الصلوٰة لدلوک الشمس الی غسق اللیل و قرآن الفجر انّ قرآن الفجر کانَ مشهوداً" نماز کو زوال آفتاب کے آغاز سے رات کی تاریکی تک ادا کرو اسی طرح قرآن فجر (نماز صبح) ادا کرو......"(۱)

"دلوک" متمایل ہوتے اور جھکنے کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں نصف النہار سے سورج کے تمایل کی طرف اشارہ ہے یعنی زوال کا وقت۔

"غسق اللیل" رات کی تاریکی کے معنی میں ہے، بعض نے اسے رات کی ابتداء سے تعبیر کیا ہے اور بعض نے آدھی رات کے معنی میں اس کی تفسیر کی ہے۔ جیسا کہ راغب نے "مفردات" میں لکھا ہے کہ "غسق" رات کی و تاریکی کی شدت کے معنی میں ہے اور یہ وہی آدھی رات کے وقت ہوتی ہے۔

ان معانی کے مطابق دلوک شمس سے نماز ظہر و عصر کے وقت کی ابتداء کی طرف اشارہ ہے اور غسق اللیل سے نماز مغرب و عشاء کے وقت کی انتہا کی طرف اشارہ ہے اور قرآن فجر سے

۱) سورۂ اسراء، آیت ۷۸۔

نماز صبح کی طرف اشارہ ہے۔

جناب فخر رازی نے اس آیت کی بہترین تفسیر بیان کی ہے، وہ یوں رقمطراز ہیں کہ:

"ان فسّرنا الغسق بظهور اوّل الظلمة. و حكاه عن ابن عباس و عطا و النضر بن شميل. كان الغسق عبارة عن اول المغرب و على هذا التقدير يكون المذكور في الآية ثلاث اوقات وقت الزوال و وقت أول المغرب و وقت الفجر، و هذا يقتضي أن يكون الزوال وقتاً للظهر و العصر فيكون هذا الوقت مشتركاً بين الصلوتين و أن يكون أول المغرب وقتاً للمغرب و العشاء فيكون هذا الوقت مشتركاً ايضاً بين هاتين الصلوتين فهذا يقتضي جواز الجمع بين الظهر و العصر و المغرب و العشاء مطلقاً"(۱)

اگر ہم کلمہ غسق کو رات کی تاریکی کے آغاز کے معنی میں تفسیر کریں (جیسا کہ ابن عباس عطا اور نضر بن شمیل بھی اسی کے قائل ہیں) تو اس وقت غسق سے مغرب کے ابتدائی وقت کی طرف اشارہ ہوگا۔ اور اس بنا پر آیت میں تین اوقات ذکر

۱) تفسیر کبیر فخر رازی، ج ۲۱، ص ۲۷۔

ہوئے ہیں زوال کا وقت۔ غروب کا وقت اور فجر کا وقت۔ اس کے بعد کہتے ہیں کہ یہ تین اوقات تقاضا کرتے ہیں کہ زوال نماز ظہر وعصر کا مشترکہ اور غروب نماز مغرب وعشاء کا مشترکہ وقت ہو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نماز ظہر اور عصر کو، اسی طرح نماز مغرب اور عشاء کو بغیر کسی قید وشرط کے اکٹھا پڑھا جاسکتا ہے"۔

جناب فخر رازی نے یہاں تک تو بالکل صحیح بات بیان کی تھی اور آیت کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھا اور سمجھایا۔ لیکن اس کے بعد کہتے ہیں کہ چونکہ ہمارے پاس دلیل موجود ہے کہ دو نمازوں کے درمیان بغیر عذر و سفر کے جمع کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے ہم آیت کو عذر کی حالت میں محدود کریں گے۔(۱)

موصوف کو یاد دہانی کرانی چاہیے کہ نہ صرف یہ کہ ہمارے پاس آیت کو صرف حال عذر میں محدود کرنے پر دلیل موجود نہیں ہے بلکہ متعدد روایات موجود ہیں (جنکی طرف اشارہ ہو چکا ہے) کہ رسولخداؐ نے بغیر عذر اور بغیر سفر کے نماز ظہر وعصر اور نماز مغرب وعشاء کو اکٹھا پڑھا تا کہ امت کو سہولت دی جاسکے اور وہ اس رخصت سے بہرہ مند ہوسکیں۔

علاوہ بر این آیت کے اطلاق کو کس طرح انتہائی محدود موارد کے ساتھ مختص کیا جاسکتا ہے؟ حالانکہ علم اصول میں یہ بات مسلم ہے کہ تخصیص اکثر جائز نہیں ہے۔

بہر حال آیت نے بالکل وضاحت کے ساتھ نماز کے جو تین اوقات ذکر کیے ہیں ان سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی ہے۔

سابقہ بیان سے ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں۔

۱) سابقہ مدرک۔

۱۔ قرآن مجید نے وضاحت کے ساتھ پانچ نمازوں کی تین اوقات میں بجا آوری کو جائز قرار دیا ہے۔

۲۔ فریقین کی کتب میں بیان کی جانے والی اسلامی احادیث سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے کئی مرتبہ دو نمازوں کو اکٹھا پڑھا حالانکہ نہ ہی سفر میں تھے اور نہ ہی کوئی اور عذر تھا۔ اور اس کام کو انہوں نے مسلمانوں کے لیے رخصت شمار کیا تا کہ وہ مشقت سے دوچار نہ ہوں۔

۳۔ اگرچہ پانچ اوقات میں نماز پڑھنا فضیلت ہے، لیکن اس فضیلت پر اصرار کرنے اور ترخیص کی راہ میں رکاوٹ بننے کی وجہ سے بہت سے لوگ بالخصوص جوان نسل اصل نماز سے فرار کر جاتے ہیں۔ اور اس بات کی تمام ذمہ داری ترخیص کے مخالفین کے دوش پر آتی ہے۔

کم از کم اہلسنت علماء اتنا قبول کرلیں کہ اس مسئلہ میں انکے جوان بھی مکتب اہلبیتؑ کے پیروکاروں کے فتوی پر عمل کرلیں جیسا کہ بزرگ عالم دین شیخ الازہر" جناب شیخ محمد شلتوت" نے مذہب جعفریہ کے تمام فتاوی پر عمل کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔

آخر میں پھر ہم دوبارہ تاکید کرتے ہیں۔ کہ ہمیں قبول کرنا چاہیے کہ آج کل دنیا میں بہت سے مزدوروں، ملازمین، سکول و کالجز کے طلاب اور دیگر طبقات کے لوگوں کے لیے پانچ اوقات میں علیحدہ علیحدہ نماز پڑھنا بہت مشکل کام ہے۔ کیا ہمیں نہیں چاہیئے کہ رسولخداؐ کی دی گئی اس سہولت سے استفادہ کریں جو آجکل کے معاشرے کو مدنظر رکھتے ہوئے عنایت کی گئی ہے تا کہ نسل جوان اور دیگر لوگ نماز ترک کرنے کے بہانے نہ بنائیں۔

کیا "سنت" پر اس حد تک اصرار کرنا صحیح ہے کہ جو "فریضہ" کے ترک کرنے کا سبب بنے؟!

۸

وضو میں پاؤں کا مسح

قرآن مجید اور پاؤں کا مسح:

وضو میں پاؤں کا مسح ایک اور ایسا اعتراض ہے جسے اہلسنت کے بعض علماء، شیعوں پر کرتے ہیں۔ چونکہ ان کی اکثریت پاؤں دھونے کو واجب سمجھتی ہیں اور پاؤں کے مسح کو کافی نہیں سمجھتی۔

حالانکہ قرآن مجید نے بالکل واضح الفاظ میں پاؤں کے مسح کا حکم دیا ہے۔ اس طرح مکتب اہلبیت کے پیروکاروں کا عمل قرآن مجید کے بالکل مطابق ہے۔ اس کے علاوہ پیغمبر اکرم کی بہت سی احادیث جن کی تعداد تقریباً تیس (۳۰) سے بھی زیادہ ہے پاؤں کے مسح کو بیان کرتی ہیں۔ اور اس کے علاوہ بہت سے اصحاب اور تابعین (وہ لوگ جو اصحاب کے بعد والے زمانے میں تھے) کا عمل پاؤں کے مسح کے بارے میں موجود ہے نہ پاؤں دھونے کے بارے میں۔

لیکن مقام افسوس ہے کہ بعض مخالفین نے ان تمام ادلّہ سے چشم پوشی کرتے ہوئے، بغیر کسی غور و فکر کے، ہم پر حملہ کرنا شروع کر دیا اور تند و تیز الفاظ کے ذریعے، حق و عدالت سے دوری اختیار کرتے ہوئے اس مذہب حقہ کے پیروکاروں کی سرزنش شروع کر دی ہے۔ ابن کثیر، مذہب اہلسنت کے معروف عالم دین اپنی کتاب "تفسیر القرآن العظیم" میں کہتے ہیں:

''روافض (ان کا مقصود اہلبیت کے پیروکار ہیں) نے وضو میں پاؤں دھونے کے مسئلہ میں مخالفت کی ہے اور جہالت و گمراہی کی وجہ سے بغیر کسی دلیل کے مسح کو کافی سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید کی آیت سے پاؤں دھونے کا وجوب سمجھا جاتا ہے۔ اور رسولخدا کا عمل بھی آیت کے مطابق تھا۔ حقیقت میں اُن کے پاس اپنے نظریہ پر کوئی دلیل نہیں ہے!!(۱)

بعض دیگر علماء نے بھی انکی اندھی تقلید کرتے ہوئے انکی بات کو اخذ کرلیا ہے اور اس مسئلہ پر تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور اپنی دلخواہ نسبت شیعوں کی طرف دی ہے۔

شاید وہ اپنے تمام مخاطبین کو عوام تصور کر رہے تھے اور انہوں نے یہ نہ سوچا کہ ایک دن محققین انکی باتوں پر تنقید کریں گے اور (انہیں باطل ثابت کریں گے) اس طرح انہیں اسلامی تاریخ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔

اس وقت ہم سب سے پہلے قرآن مجید کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور اس مسئلہ کا فیصلہ دریافت کرتے ہیں۔ سورۃ مائدہ (کہ جو پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والی سب سے آخری سورت ہے) کی آیت نمبر۶ میں یوں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"یا ایھا الذین آمنوا إذا قمتم الیٰ الصلوٰة
فاغسلوا وُجوھکم و أیدیکم الیٰ المرافق و
امسَحُوا برُءوسکم و أرجلکم الیٰ الکعبین"

اے صاحبان ایمان جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے چہروں اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولو اور اپنے سر اور پاؤں کا ابھری ہوئی جگہ تک مسح کرو"

۱) تفسیر القرآن العظیم، جلد۲، ص۵۱۸۔

واضح ہے کہ کلمہ "ارجلکم" (اپنے پاؤں) کا کلمہ "رؤوسکم" (اپنے سر) پر عطف ہے اور اس وجہ سے دونوں کا مسح کرنا واجب ہے نہ کہ دھونا۔ چاہے "ارجلکم" کو نصب کے ساتھ پڑھا جائے یا جر کے ساتھ (غور کیجئے) (۱)

۱) اس مطلب کی وضاحت یہ ہے کہ کلمہ "ارجلکم" کے اعراب کے بارے میں دو مشہور قرائتیں ہیں ایک جر کے ساتھ قرائت کہ جسے بعض مشہور قراء جیسے حمزہ، ابوعمرو، ابن کثیر اور حتی عاصم نے (ابوبکر کی روایت کے مطابق) لام کی زیر کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسری طرف بعض مشہور قراء نے اسے نصب کے ساتھ پڑھا ہے اور آجکل قرآن مجید کے تمام رائج نسخوں میں اسی دوسری قرأت کے مطابق اعراب لگایا گیا ہے۔

لیکن دونوں اعراب کے مطابق یقیناً معنیٰ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ کیونکہ اگر زیر کے ساتھ پڑھا جائے تو بالکل واضح ہے کہ "ارجلکم" کا "رؤس" پر عطف ہے اس کا معنیٰ یہ ہے کہ وضو میں پاؤں کا مسح کرو (جسطرح سر کا مسح کرتے ہو) اگر شیعہ اس قرأت کے مطابق عمل کریں کہ جس کے اور بھی بہت سے طرفدار ہیں تو اس میں کیا عیب ہے؟

اور اس سے بڑھ کر اگر فتح (زبر) کے ساتھ بھی پڑھا جائے پھر بھی "ارجلکم" کا عطف "برؤسکم" کے محل پر ہوگا اور واضح ہے کہ برؤسکم محل کے اعتبار سے منصوب ہے کیونکہ "وامسحوا" کا مفعول ہے۔ پس دونوں صورتوں میں آیت کا معنیٰ یہی ہے گا کہ پاؤں کا مسح کرو۔

ہاں بعض لوگوں نے یوں خیال کیا ہے کہ اگر "ارجلکم" کو فتح (زبر) کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا "وجوھکم" پر عطف ہوگا یعنی ہاتھ اور منہ کو دھویے اس طرح پاؤں کو دھو لیجئے!! حالانکہ یہ بات ادبیات عرب کے قواعد کے بھی خلاف اور قرآن مجید کی فصاحت کے ساتھ بھی سازگار نہیں ہے۔

بہر حال یہ بات ادبیات عرب کے اس لئے خلاف ہے کیونکہ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان کبھی اجنبی جملہ واقع نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ ایک معروف اہلسنت عالم کے بقول محال ہے کہ "ارجلکم" کا "وجوھکم" پر عطف ہو کیونکہ ہرگز فصیح عربی میں ایسا جملہ نہیں بولا جاتا ہے کہ مثلا کوئی کہے "ضربت زیداً و مررت ببکر و عمراً" کہ "میں نے زید کو مارا اور بکر کے قریب سے گزرا اور عمر کو" یعنی عمر کو مارا [illegible]

بہر حال قرآن مجید نے پاؤں کے بارے میں مسح کا حکم دیا ہے۔

عجیب توجیہات

بعض لوگوں نے جب قرآن مجید کے حکم کو اپنے پہلے سے معین کردہ مفروضہ کے خلاف دیکھا تو توجیہات کرنا شروع کر دیں۔ ایسی توجیہات کہ جو انسان کو حیران کر دیتی ہیں۔ من جملہ:

۱۔ یہ آیت سنتِ پیغمبرؐ کی وجہ سے اور جو احادیث آپؐ سے نقل ہوئی ہیں انکی خاطر منسوخ ہوگئی ہو! ابن حزم نے اپنی کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" میں لکھا ہے کہ "چونکہ سنت میں پاؤں دھونے کا حکم آیا ہے اس لیے ہمیں قبول کرنا چاہیے کہ مسح والا حکم منسوخ ہوگیا ہے"۔

جبکہ اولاً: تمام مفسرین نے اس بات کو قبول کیا ہے کہ سورہ مائدہ وہ آخری سورہ ہے جو پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوئی ہے اور اس کی کوئی بھی آیت منسوخ نہیں ہوئی ہے۔

حتی کہ عام افراد بھی اس قسم کا جملہ نہیں بولتے ہیں چہ جائیکہ قرآن مجید جو فصاحت کا اکمل و اتم نمونہ ہے اس قسم کا جملہ بیان کرے۔

پس جس طرح اہلسنت کے بعض محققین نے کہا ہے کہ بلا شک وشبہ نصب کی صورت میں کلمہ "وارجلکم" عطف "برءوسکم" کے محل پر ہوگا اور بہر حال میں آیت کا مفہوم یہی ہے کہ وضو کرتے وقت سر اور پاؤں کا مسح کرو۔

ثانیاً: جس طرح عنقریب بیان کیا جائیگا کہ جہاں پیغمبر اکرمؐ سے وضو میں پاؤں دھونے والی روایات نقل ہوئی ہیں اُن کے مقابلے میں آپؐ سے ہی متعدد روایات پاؤں کے مسح کے بارے میں بھی نقل ہوئی ہیں کہ آپؐ وضو میں پاؤں کا مسح کیا کرتے تھے۔

کس طرح ممکن ہے کہ ہم قرآن مجید کے دستور کو اس قسم کی روایات کے ذریعے نسخ کریں۔

علاوہ برایں، تعارضِ روایات کے باب میں ثابت کیا گیا ہے کہ جب بھی روایات کے درمیان تضاد ہو تو قرآن مجید سے ان کی مطابقت کرنی چاہیے، جو روایات قرآن مجید کے مطابق ہوں انہیں قبول کر لینا چاہیے اور جو قرآن مجید کے مخالف ہوں ان پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ دوسرے کچھ افراد جیسے "جصاص" نے "احکام القرآن" نامی کتاب میں لکھا ہے کہ "وضو والی آیت مجمل ہے اور ہم احتیاط پر عمل کرتے ہوئے پاؤں دھو لیتے ہیں تاکہ دھونا بھی صادق آجائے اور مسح بھی" (۱)

حالانکہ سب جانتے ہیں کہ (غسل) "دھونا" اور "مسح کرنا" دو مختلف اور متباین مفہوم ہیں اور دھونا ہرگز مسح کو شامل نہیں ہوتا ہے۔

لیکن کیا کیا جائے انکی پہلے سے تفاوت انہیں قرآن مجید کے ظہور پر عمل نہیں کرنے دیتی۔

---

(۱) احکام القرآن، جلد ۲، ص ۳۴۳۔

۳۔ جناب فخر رازی کہتے ہیں کہ حتیٰ اگر "جر" کے ساتھ بھی قرأت کی جائے یعنی "ارجلکم" کا "رؤوسکم" پر عطف کیا جائے تو بالکل واضح طور پر یہ پاؤں کے مسح پر دلالت کرتا ہے، لیکن پھر بھی اس کا مقصد پاؤں کا مسح کرنا نہیں ہوگا، بلکہ پاؤں کے مسح سے مُراد یہ ہوگی کہ پاؤں دھوتے وقت پانی استعمال کرنے میں اسراف نہ کرو"(۱)

حالانکہ اگر آیاتِ قرآن میں اس قسم کے اجتہاد اور تفسیر بالرای کا دروازہ کُھل جائے تو پھر ظواہر قرآن پر عمل کرنے کے لیے کوئی چیز باقی نہیں رہے گی۔ اگر ہمیں اجازت ہو کہ ہم "مسح" کو "دھوتے وقت اسراف نہ کرنے" کے معنی میں لے لیں تو پھر تمام آیات کے ظواہر کی دوسری طرح تفسیر کی جاسکتی ہے۔

نص کے مقابلے میں اجتہاد اور تفسیر بالرای:

بہت سے قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ جسطرح ہمارے زمانے میں اجتہاد در مقابل نص ایک قبیح اور غیر قابل قبول امر سمجھا جاتا ہے، اسلام کے ابتدائی زمانے میں اسطرح نہیں تھا، با الفاظ دیگر جسطرح آج ہم احادیثِ پیغمبرؐ اور آیاتِ قرآن کے مقابلے میں تعبد اور تسلیم محض رکھتے ہیں۔ اُس زمانے میں یہ تعبد اس شدت و قوت کے ساتھ نہیں تھا۔

مثلاً جب حضرت عمر نے اپنے معروف جملے میں یوں کہا کہ " **متعتان کانتا محللتان فی زمن النبیؐ و أنا أحرمهما و اعاقب علیهما متعة النساء و متعة الحج**"(۱)

۱) تفسیر کشاف، جلد ۱، ص ۶۱۰۔

جو رسولؐ خدا کے زمانے میں حلال تھے میں اُن دونوں کو حرام کرتا ہوں اور جو بھی اس حکم کی مخالفت کریگا میں اسے سزا دونگا، ایک متعہ النساء اور دوسرا متعہ حج (۱) (یعنی حج تمتع اپنے خاص احکام کے ساتھ" تو بہت کم یا اصلاً دیکھنے میں نہیں آیا ہے کہ اصحاب میں سے کسی نے اُن پر تنقید کی ہو اور کہا ہو کہ نص کے مقابلے میں اجتہاد جائز نہیں ہے (اور وہ بھی اس شدت کے ساتھ)۔

حالانکہ اگر ہمارے زمانے میں کوئی بڑے سے بڑا مسلمان فقیہ یا دانشمند کہہ دے کہ "فلاں عمل رسولؐ خدا کے زمانے میں حلال تھا اور میں اسے حرام کر رہا ہوں" سب اس پر تعجب کریں گے اور اس کی بات کو فضول اور غیر قابل قبول سمجھیں گے اور جواب میں کہیں گے کہ کسی کو بھی حق نہیں ہے کہ حرام خدا کو حلال یا حلال خدا کو حرام کر سکے کیونکہ احکام کو منسوخ کرنا یا نص کے مقابلے میں اجتہاد کرنا کسی کے لیئے جائز نہیں ہے۔

لیکن اسلام کے ابتدائی زمانے میں اسطرح نہیں تھا۔ اسی لیے بعض موارد دیکھنے کو ملتے ہیں کہ جس میں فقہاء، احکام الٰہی کے مقابلے میں مخالفت کی جرأت کرتے تھے۔

شاید پاؤں پر مسح کے انکار اور اسے دھونے میں تبدیل کرنے کا مسئلہ بھی اسی اجتہاد کا شکار ہوا ہوگا۔ شاید بعض لوگوں نے سوچا ہوگا کہ پاؤں چونکہ آلودگی کے نزدیک رہتے ہیں، بہتر ہے کہ انہیں دھولیا جائے چونکہ ان کے مسح کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

بالخصوص اُس زمانے میں تو بعض لوگ ننگے پاؤں رہتے تھے اور بالکل جوتے نہیں پہنتے تھے اسی وجہ سے آداب احترام مہمان میں سے ایک یہ تھا کہ گھر میں داخل ہوتے وقت اس کے پاؤں دھلواتے تھے!

۱) اِن احادیث کے مصادر، نکاح موقت کی بحث میں بیان ہو چکے ہیں۔

ہماری اس بات پر گواہ صاحب تفسیر المنار کا کی کلام ہے جسے انہوں آیت وضو کے ذیل میں پاؤں دھونے کے قائل افراد کی توجیہ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "پاؤں پر تر ہاتھ کھینچ دینے سے، کہ جو اکثر اوقات غبار آلود اور کثیف ہوتے ہیں نہ صرف کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ پاؤں زیادہ کثیف ہو جاتے ہیں اور ہاتھ بھی آلودہ اور کثیف ہو جاتا ہے۔

اور اہلسنت کے معروف فقیہ ابن قدامہ (متوفی ۶۲۰ ھ ق) بعض علماء سے نقل کرتے ہیں کہ پاؤں چونکہ آلودگی کے نزدیک ہیں جبکہ سر اس طرح نہیں ہے لہذا مناسب ہے کہ پاؤں کو دھولیا جائے اور سر کا مسح کرلیا جائے (۱) اسطرح انہوں نے اپنے اجتہاد اور استحسان کو ظاہر قرآن پر ترجیح دیتے ہوئے مسح کو چھوڑ دیا ہے اور آیت کی غلط توجیہ کردی ہے۔

اس گروہ نے شاید اس بات کو بھلا دیا ہے کہ وضو نظافت اور عبادت دونوں کا مرکب ہے، سر کا مسح کرنا وہ بھی بعض کے فتویٰ کے مطابق صرف ایک انگلی کے ساتھ، نظافت کا فائدہ نہیں دیتا ہے اس طرح پاؤں کا مسح بھی۔

حقیقت میں سر اور پاؤں کا مسح اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ وضو کرنے والا آدمی سر سے لیکر پاؤں تک اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو۔ ورنہ نہ تو سر کا مسح نظافت کا موجب بنتا ہے اور نہ ہی پاؤں کا مسح۔

بہر حال ہم اللہ تعالیٰ کے فرمان کے تابع ہیں اور ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ اپنی قاصر عقول کے ساتھ احکام الٰہی میں تبدیلیاں کریں۔ جس وقت قرآن مجید نے پیغمبرؐ پر نازل ہونے والی آخری سورت میں حکم دے دیا ہے کہ اپنے ہاتھ اور منہ کو دھولو اور سر اور پاؤں کا مسح کرلو تو

---

۱) المغنی ابن قدامہ، جلد ۱، ۱۷۱۔

ہمیں اپنی ناقص عقلوں کے ذریعے فلسفہ چینی کر کے اس حکم کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے اور اپنی مخالفتوں کی توجیہ کے لیے کلام خدا کی نامعقول توجیہات نہیں کرنی چاہئیں۔

تفسیر بالرای اور نص کے مقابلے میں اجتہاد دو ایسی عظیم مصیبتیں ہیں جنہوں نے بعض مقامات میں فقہ اسلامی کے چہرے کو مخدوش کر دیا ہے۔

جوتوں پر مسح کرنا!

واقعاً یہ عجیب بات کہ جس نے ہر غیر جانبدار محقق کو حیرت میں ڈال دیا ہے کہ یہی برادران کہ جو وضو میں پاؤں پر مسح کے جائز نہ ہونے پر اتنا اصرار کرتے ہیں اور پاؤں دھونے کو واجب سمجھتے ہیں۔ اکثر وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ پاؤں دھونے کی بجائے جوتوں پر مسح کیا جاسکتا ہے وہ بھی مجبوری کے عالم میں نہیں بلکہ اختیار کی حالت میں اور صرف سفر میں نہیں بلکہ حضر میں بھی اور ہر حال میں جوتوں پر مسح کیا جاسکتا ہے۔

واقعاً انسان اس قسم کے احکام پڑھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ پاؤں کا دھونا واجب تھا اور یا پھر جوتوں کے اوپر سے مسح جائز ہو گیا ہے!

البتہ ایک گروہ کہ جو فقہِ اہلسنت کی نظر میں اقلیت شمار ہوتے ہیں جوتوں پر مسح کو جائز نہیں سمجھتے ہیں جیسے حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام، جناب ابن عباس اور امام مالک کہ جو اہلسنت کے ایک امام ہیں (انکے فتویٰ کے مطابق جوتوں پر مسح جائز نہیں ہے)۔

دلچسپ یہ ہے کہ حضرت عائشہ، کہ اہلسنت برادران جنکے فتاویٰ اور روایات کے لیے خاص اہمیت کے قائل ہیں، ایک مشہور حدیث میں فرماتی ہیں کہ "لئن تقطع قدمایی احب الیّ من ان امسح علی الخفین" اگر میرے دونوں پاؤں [illegible] لیے

اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ میں (وضو میں) جوتوں پر مسح کروں"(۱)

جبکہ وہ دن رات پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ رہتی تھیں اور آپ کا وضو دیکھ چکی تھیں۔

بہر حال اگر یہ برادران اہل بیت رسولؐ کی احادیث کی پیروی کرتے کہ جو ظاہر قرآن کے مطابق ہیں تو کبھی بھی پاؤں کے مسح کے علاوہ کسی چیز کو قبول نہ کرتے۔

پیغمبر اکرمؐ نے معتبر اور صحیح حدیث میں فرمایا کہ "میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک کتاب خدا اور دوسری میری عترت اور اہلبیت کہ اگر ان دونوں سے تمسک کروگے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ تین چیزوں میں، میں کسی سے تقیہ نہیں کرتا ہوں ا۔ مسکرات کے نہ پینے میں (چونکہ بعض فقہاء نبیذ کو جائز سمجھتے تھے) ۲۔ جوتوں پر مسح والے مسئلہ میں اور ۳۔ حج تمتع میں۔" ثلاثۃ لا اتقی فیھن احداً شرب المسکر و مسح الخفین و متعۃ الحج" (۲)

پاؤں پر مسح اور احادیث اسلامی:

امامیہ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ وضو میں پاؤں کے مسح کے علاوہ کوئی چیز قابل قبول نہیں ہے۔ اور اس مسئلہ میں اہلبیت علیہم السلام کے واسطہ سے منقول روایات بھی بالکل واضح ہیں۔

آپ نے امام باقر علیہ السلام سے نقل کی گئی مذکورہ بالا روایت کو ملاحظہ فرمایا کہ جو بالکل واضح ہے، اسی قسم کی اور بہت سی روایات موجود ہیں۔

---

۱) مبسوط سرخسی، جلد ا، ص ۹۸۔

۲) کافی، جلد ۳، ص ۳۲۔

لیکن جو احادیث اہلسنت کی کتب میں بیان ہوئی ہیں وہ ایک دوسرے سے مکمل طور پر اختلاف رکھتی ہیں۔ دسیوں احادیث پاؤں پر مسح کی طرف اشارہ یا اسے بیان کرتی ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ سر کے مسح کے بعد پاؤں پر مسح کرتے تھے، جبکہ بعض دوسری احادیث میں پاؤں دھونے کو پیغمبرؐ کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ اور بعض میں جوتوں پر مسح کرنے کی نسبت دی گئی ہے!

احادیث کی پہلی قسم کہ جو صرف مسح کا حکم دیتی ہیں اہل سنت کی معروف کتب میں موجود ہیں جیسے:

۱۔ صحیح بخاری
۲۔ مسند احمد
۳۔ سنن ابن ماجه
۴۔ مستدرک حاکم
۵۔ تفسیر طبری
۶۔ درّ المنثور
۷۔ کنز العمال

وغیرہ کہ ان کتب کا معتبر ہونا اہلسنت کے نزدیک مسلم ہے۔

اور ان روایات کے راوی بھی مشہور اصحاب میں سے ہیں۔ جیسے:

ا۔ امیر المومنین علیؑ
۲۔ جناب ابن عباس
۳۔ انس بن مالک (پیغمبر اکرمؐ کے مخصوص خادم)
۴۔ جناب عثمان بن عفان
۵۔ بسر بن سعید
۶۔ رفاعہ
۷۔ ابوظبیان وغیرہ

ہم یہاں ان روایات میں سے صرف پانچ کو نقل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔

ہمیں تعجب تو آلوسی جیسے مشہور مفسّر کی بات پر ہے، وہ کہتے ہیں کہ پاؤں پر مسح کے بارے میں صرف ایک روایت ہے جو شیعوں کے لیے ثبوت بن گئی ہے!!(۱)

۱۔ عن علیّ ابن ابی طالب (ع) قال: کنتُ اری ان باطن القدمین احق بالمسح من ظاهرهما حتی رایتُ رسول اللّٰه (ص) یمسح ظاهرَهما:

"امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں خیال کرتا تھا کہ پاؤں کے تلوے ان کی پشت کی نسبت مسح کرنے کے زیادہ سزاوار ہیں یہاں تک کہ میں نے رسول خدا کو دیکھا کہ پاؤں کی پشت پر مسح کرتے ہیں"(۲)

۲۔ عن ابی مطر قال: بینما نحن جلوس مع علی علیہ السلام فی المسجد، جاء رجلٌ الیٰ علیّ علیہ السلام و قال: ارنی وضوء رسول اللّٰه فدعا قنبر فقال ائتنی بکوز من ماء، فغسل یده و وجهه ثلاثاً فادخل بعض أصابعة فی فیه و استنشق ثلاثاً و غسل ذراعیه ثلاثاً و مسح رأسه واحدة ..... و رجلیه الی الکعبین"(۳)

۱) روح المعانی، جلد ۶، ۸۷۔

۲) مسند احمد جلد ۱ ص ۱۲۴۔

۳) کنز العمال، جلد ۹ ص ۴۴۸۔

ابی مطر کہتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ حضرت علی کے ہمراہ مسجد میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں ایک آدمی آیا اور آپ کی خدمت میں عرض کرنے لگا کہ مجھے رسول خدا جیسا وضو کرکے دکھایئے، آپ نے قنبر کو آواز دی اور فرمایا کہ پانی کا ایک برتن لے آؤ، اس کے بعد آپ نے ہاتھ اور منہ کو تین مرتبہ دھویا۔ انگلی کے ذریعے دانت صاف کیے اور تین مرتبہ استنشاق کیا (ناک میں پانی ڈالا) اور پھر (چہرے) اور ہاتھوں کو تین مرتبہ دھویا اور ایک مرتبہ سر کا مسح اور ایک مرتبہ ابھری ہوئی جگہ تک پاؤں کا مسح کیا"

اگرچہ دونوں حدیثیں امیر المومنین علی علیہ السلام کے توسط سے پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہیں لیکن دو مختلف واقعات کو حکایت کرتی ہیں۔ اور ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ رسول خداؐ وضو کے دوران پاؤں پر مسح کیا کرتے تھے۔

۳: عن بسر بن سعید قال: أتی عثمان المقاعد فدعا بوضوء فتمضمض و استنشق، ثم غسل وجهه ثلاثاً و یدیه ثلاثاً ثلاثاً ثم مسح برأسه و رجلیه ثلاثاً ثلاثاً، ثم قال: رایتُ رسول اللّٰه هکذا توضأ، یا هؤلاء اکذلک؟ قالوا: نعم لنفر من اصحاب رسول اللّٰهؐ عنده:(۱)

بسر بن سعید نقل کرتے ہیں کہ حضرت عثمان بیٹھک میں (جہاں لوگ مل بیٹھتے ہیں) آئے اور وضو کے لیے پانی مانگا اور کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا، اس کے بعد

۱) مسند احمد، جلد ۱ ص ۶۷۔

چہرے کو تین مرتبہ دھویا اور دونوں ہاتھوں کو بھی تین تین مرتبہ دھویا اور سر اور پاؤں کا تین مرتبہ مسح کیا، اس کے بعد کہنے لگے میں نے پیغمبر اکرمؐ کو دیکھا ہے کہ اس طرح وضو فرماتے تھے (اس کے بعد حاضرین محفل کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ جو اصحاب رسول تھے) اے لوگو! کیا اسی طرح ہے؟ سب نے کہا جی ہاں!"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف حضرت عثمان بلکہ دیگر اصحاب بھی صراحت کے ساتھ گواہی دیتے تھے کہ پیغمبر اکرمؐ وضو کے وقت پاؤں پر مسح کیا کرتے تھے (اگر چہ اس روایت میں سر اور پاؤں کا مسح تین مرتبہ ذکر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے بعض اصحاب کی نظر میں یہ مستحب ہو یا راوی کا اشتباہ ہو)

٤:عن رفاعة بن رافع انه، سمع رسول اللهؐ يقول: انه لا تتم صلوة لأحد حتى يسبغ الوضوء، كما أمره الله عز وجل يغسل وجهه و يديه الى المرفقين و يمسح برأسه و رجليه الى الكعبين۔

رفاعہ بن رافع کہتے ہیں کہ میں نے رسول خدا سے سنا فرمارہے تھے تم میں سے کسی کی نماز اس وقت تک صحیح نہیں ہے جب تک اس طرح وضو نہ کرے جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے: کہ چہرے کو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوئے اور سر کا اور پاؤں کا ابھری ہوئی جگہ تک مسح کرے"(۱)

۱) سنن ابن ماجہ، جلد ۱، ص ۱۵۶۔

٥:عن ابى مالك الاشعرى انه قال لقومه: اجتمعوا اصلى بكم صلوة رسول الله صلى الله عليه و آله و سلم فلمّا اجتمعوا قال: هل فيكم احد من غيركم؟ قالوا لا الا ابن اخت لنا، قال: ابن اخت القوم منهم، فدعا بجفنة فيها ماء فتوضا و مضمض و استنشق و غسل وجهه ثلاثا و ذراعيه ثلاثا ثلاثا و مسح برأسه و ظهر قدميه ثم صلى بهم(۱)

ابو مالک اشعری سے نقل ہوا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ جمع ہو جاؤ تا کہ میں تمہارے سامنے رسول خدا جیسی نماز پڑھوں۔ جب سب جمع ہو گئے تو انہوں نے پوچھا تمہارے درمیان کوئی غیر تو نہیں ہے؟ سب نے کہا نہیں صرف ایک ہمارا بھانجا ہے (کہ ہماری اس بہن کی شادی دوسرے قبیلے میں ہوئی تھی) کہنے لگے، کوئی بات نہیں۔ بھانجا بھی قبیلہ کا فرد ہوتا ہے (اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور کی حکومت کی طرف سے۔ بعض سیاسی مسائل کی وجہ سے۔ رسول خدا کی نماز یا وضو کی وضاحت کرنا ممنوع تھا) اس کے بعد انہوں نے پانی کا برتن مانگا اور اس طرح وضو کیا۔ کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا اور چہرے کو تین مرتبہ دھویا اسی طرح ہاتھوں اور بازوؤں کو تین مرتبہ دھویا اس کے بعد سر کا اور پاؤں کی پشت کا مسح کیا اس کے بعد اپنے قبیلہ کے ساتھ نماز پڑھی"۔

۱) مسند احمد، جلد ۵، ص ۳۴۲۔

مندرجہ بالا نقل ہونے والی روایات، اُن روایات کا مختصر سا حصہ ہیں جو اہلسنت کی معروف کتب میں مشہور راویوں کے توسط سے نقل ہوئی ہیں۔ لہٰذا جو لوگ کہتے ہیں کہ اس بارے میں کوئی روایت نقل نہیں ہوئی یا صرف ایک روایت نقل ہوئی ہے وہ ناآگاہ اور متعصب قسم کے لوگ ہیں جو خیال کرتے ہیں کہ شاید حقائق سے چشم پوشی کرنے یا ان کا انکار کرنے کی وجہ سے انہیں ختم کیا جا سکتا ہے۔

یہ وہی لوگ ہیں جو سورۂ مائدہ کی آیت کے مسح کے وجوب پر دلالت کرنے سے انکار کرتے ہیں اور حتیٰ کہ کہتے ہیں کہ یہ آیت صراحت کے ساتھ پاؤں دھونے پر دلالت کرتی ہے جس کی وضاحت سابقہ صفحات پر گذر چکی ہے۔

مخالف روایات:

ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے ہیں کہ سابقہ روایات کے مقابلے میں دو قسم کی دوسری روایات بھی اہلسنت کی معروف کتب میں نقل ہوئی ہیں۔

ان میں سے ایک گروہ وہ روایات ہیں جو کہتی ہیں کہ رسولخداؐ وضو کے وقت پاؤں دھوتے تھے۔ اور دوسرا گروہ ان روایات کا ہے جو کہتی ہیں کہ آپؐ وضو کے وقت نہ پاؤں کو دھوتے تھے اور نہ مسح کرتے تھے بلکہ جوتوں پر مسح کرتے تھے!!

ایسے وقت میں ہمیں علم اصول کے مسلّم قاعدہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اگر ایک مسئلے کے بارے میں روایات کے دو گروہ آپس میں متضاد اور متعارض ہوں تو سب سے پہلے دلالت کے لحاظ سے جمع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے یعنی ان روایات کی اس طرح تفسیر کرنی چاہیے کہ تضاد ختم ہو جائے اور روایات آپس میں جمع ہو جائیں (البتہ یہ تفسیر اور جمع، عرفی فہم

کے معیاروں کے مطابق ہونی چاہیے)۔

اور اگر یہ جمع دلالی ممکن نہ ہو تو پھر روایات کی قرآن مجید کے ساتھ تطبیق کرنا چاہیے۔ یعنی دیکھنا چاہیے کہ کونسی روایت قرآن مجید کے مطابق ہے اسے اخذ کرنا چاہیے اور دوسری روایت کو ترک کرنا چاہیے۔ یہ ایسا قانون ہے جو معتبر ادلّہ کے ذریعے ثابت ہے۔

اب اس قاعدہ کے مطابق ان دو قسم کی (مسح اور دھونے والی) روایات کے درمیان جمع یوں کیا جا سکتا ہے کہ رسولخداؐ وضو کے دوران مسح والے حکم پر عمل کرتے تھے اور بعد میں نظافت کے لیے کبھی پاؤں کو دھولیا کرتے تھے اور یہ دھونا وضو کا حصہ نہیں تھا۔ بعض راوی جو اس منظر کا مشاہدہ کر رہے ہوتے تھے خیال کرتے کہ یہ پاؤں دھونا، وضو کا جزء ہے۔

اتفاق سے شیعوں میں بھی بہت سے افراد اکثر یہی کام کرتے ہیں یعنی وضو میں مسح والے فریضے پر عمل کرنے کے بعد صفائی کی خاطر اپنے دونوں پاؤں کو اچھی طرح دھو لیتے ہیں۔

اور اس زمانے میں اس کام کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی تھی کیونکہ گرمی کی وجہ سے کھلے جوتے پہنے جاتے تھے نہ کہ بند جوتے، اور کھلے جوتے میں پاؤں جلدی آلودہ ہوتے ہیں۔

بہر حال پاؤں کا مسح ایک واجبی فریضہ تھا جو عام طور پر دھوئے جانے والے پاؤں سے جدا تھا۔

یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ بعض فقہاء کو نص کے مقابلہ میں اجتہاد نے اکسایا ہو کہ مسح کے مقابلے میں پاؤں دھونے کا فتویٰ دیں کیونکہ انہوں نے سوچا ہوگا کہ پاؤں کی آلودگی صرف دھونے سے ہی دور ہو سکتی ہے۔ اس لیے انہوں نے سورۂ مائدہ کے ظہور کو ترک کر دیا جو واضح طور پر مسح کا حکم دیتا ہے جیسا کہ علمائے اہلسنت کے بعض کلمات میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہتر یہ ہے کہ آلودگی کو دور کرنے کیلئے پاؤں کو دھولیا جائے [illegible] مسح کافی نہیں ہے

سہل اور آسان شریعت:

یقیناً اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جو روئے زمین کے تمام علاقوں اور تمام زمانوں کے لیئے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مکمل طور پر آسان اور سہل شریعت ہے۔ ذرا سوچئے دن رات میں پانچ مرتبہ پاؤں کو دھونا، دنیا کے مختلف علاقوں میں کتنی مشکلات ایجاد کریگا۔ اس سختی کی وجہ سے ممکن ہے بعض لوگ وضو اور نماز سے بیزار ہو جائیں۔

اور یہ نص کے مقابلے میں اجتہاد اور مسح کی روایات کو چھوڑنے کا نتیجہ ہے۔

یہ احتمال بھی منتفی نہیں ہے کہ پاؤں دھونے کی بعض احادیث (نہ ساری احادیث) بنوامیہ کے دور میں کہ جب احادیث گھڑنے کا بازار گرم تھا اور معاویہ جعلی احادیث گھڑنے کے لیے بہت سی رقم خرچ کرتا تھا، جعل کی گئی ہوں۔ کیونکہ سب لوگ جانتے تھے کہ حضرت علی وضو میں پاؤں کے مسح کے قائل ہیں اور معاویہ کا اصرار تھا کہ ہر چیز میں علیؑ کی مخالفت کی جائے اور برعکس عمل کیا جائے۔ مندرجہ ذیل دو احادیث پر غور کیجئے۔

ا۔ صحیح مسلم میں بیان ہوا ہے کہ معاویہ نے سعد بن ابی وقاص کو حکم دیا کہ امیرالمومنین علیؑ پر سب و شتم کرے اور لعنت کرے! (کیونکہ سعد بن ابی وقاص سختی کے ساتھ اس کام سے پرہیز کرتے تھے) سعد نے کہا میں نے رسولخدا کی زبان سے تین فضیلتیں علیؑ کے بارے میں ایسی سنی ہیں جنہیں میں کبھی نہیں بھلا سکتا ہوں، اے کاش ان میں سے ایک فضیلت میرے لیے بھی ہوتی تو میں اسے عظیم ثروت پر ترجیح دیتا۔ اس کے بعد انہوں نے جنگ تبوک کا واقعہ اور "اما ترضی ان تکون لی بمنزلة هارون من موسی" کا جملہ نقل کیا۔ اسی طرح جنگ خیبر کا واقعہ اور حضرت علیؑ کی شان میں رسولخدا کا مشہور جملہ جو آپؐ نے حضرت علیؑ کے بارے

میں فرمایا تھا اور واقعہ مباہلہ کو نقل کیا۔(۱)

اس حدیث سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ معاویہ، امیرالمومنین علی علیہ السلام کی مخالفت پر کتنا اصرار کرتا تھا۔

۲: بہت سی روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں دو گروہوں نے جعل حدیث کا سلسلہ شروع کیا تھا۔

ایک گروہ۔ بظاہر صالح اور زاہد (مگر سادہ لوح) افراد پر مشتمل تھا جو قصد قربت کے ساتھ احادیث گھڑتا تھا۔ ان میں سے بعض ایسے دیندار لوگ تھے جو لوگوں میں تلاوت قرآن کی رغبت ایجاد کرنے کے لیے اس کی سورتوں کے فضائل کے بارے میں عجیب و غریب احادیث بناتے تھے اور پیغمبر اکرمؐ کی طرف نسبت دیتے تھے اور مقام افسوس یہ ہے کہ ان کی تعداد بھی کم نہیں تھی!

اہلسنت کے معروف عالم جناب قرطبی اپنی کتاب تذکار کے (ص ۱۵۵) پر لکھتے ہیں: کہ ان احادیث کا کوئی اعتبار نہیں جنہیں جھوٹی احادیث گھڑنے والوں نے قرآن مجید کی سورتوں کے فضائل کے بارے میں جعل کیا ہے۔ کیونکہ یہ کام ایک بڑی جماعت نے قرآن کی سورتوں کے فضائل میں بلکہ تمام اعمال کے بارے میں انجام دیا ہے انہوں نے قصد قربت کے ساتھ احادیث گھڑی ہیں۔ وہ خیال کرتے تھے کہ اس انداز میں لوگوں کو نیک اعمال کی طرف دعوت دیتے ہیں (وہ لوگ جھوٹ کو جو کہ ایک بدترین گناہ ہے زہد و فقاہت کے ساتھ بالکل منافی نہیں سمجھتے تھے!!)

---

۱) صحیح مسلم، جلد ۷، ص ۱۲۰۔

یہی دانشمند (قرطبی) اپنی کتاب کے بعد والے صفحہ پر خود "حاکم" سے اور بعض شیوخ محدثین سے نقل کرتے ہیں کہ ایک زاہد نے اپنی طرف سے قربۃ الی اللہ قرآن مجید اور اس کی سورتوں کے فضائل کے بارے میں احادیث جعل کیں جب اس سے پوچھا گیا کہ یہ کام تم نے کیوں کیا ہے؟ تو کہنے لگے میں نے دیکھا ہے کہ لوگ قرآن مجید کی طرف کم توجہ کرتے ہیں انہیں رغبت دلانے کے لیئے میں نے یہ کام کیا ہے۔ اور جب ان کو کہا گیا کہ پیغمبر اکرمؐ نے خود فرمایا ہے کہ "من کذب علیّ فلیتبوء مقعده من النّار" جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ تو جواب میں کہنے لگے پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ "من کذب علیّ ......" جس نے میرے خلاف جھوٹ بولا۔ اور میں نے تو آپؐ کے فائدے میں جھوٹ بولا ہے!!

اس قسم کی احادیث نقل کرنے میں قرطبی تنہا نہیں ہیں بلکہ اہلسنت کے بعض دیگر علماء نے بھی انہیں نقل کیا ہے (مزید وضاحت کے لیے کتاب "الغدیر" کی پانچویں جلد میں "کذابین اور وضاعین" کی بحث کیطرف رجوع کیجئے)۔

دوسرا گروہ: ان لوگوں کا تھا جو بھاری رقم لے کر معاویہ اور بنو امیہ کے حق اور امیر المومنینؑ کی مذمت میں احادیث گھڑتے تھے۔ ان میں سے ایک سمرۃ ابن جندب تھا جس نے چار لاکھ درہم معاویہ سے لیے اور یہ حدیث امیر المومنینؑ کی مذمت اور انکے قاتل کی شان میں گھڑی اور کہا کہ یہ آیت شریفہ "و من الناس من یشری نفسه ، ابتغاء مرضات اللّٰہ ......" (۱) علیؑ کے قاتل عبدالرحمن ابن ملجم کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

۱) سورۂ بقرۃ آیت ۲۰۷۔

اور یہ آیت "و من الناس من یُعجبک قوله فی الحیاة الدنیا......" (۱) علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (۲)

نعوذ باللہ من ھذہ الاکاذیب۔

اس بناء پر تعجب نہیں ہے کہ علی علیہ السلام کی مخالفت میں کچھ روایات وضو میں پاؤں دھونے کے لیے جعل کر دی گئی ہوں۔

جوتوں پر مسح، عقل و شرع کے ترازو میں:

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ پاؤں پر مسح کے مسئلہ کی شدت کے ساتھ نفی کرتے ہیں اور پاؤں دھونے کو واجب سمجھتے ہیں۔ وہی لوگ اجازت دیتے ہیں کہ وضو میں جوتوں پر مسح کیا جا سکتا ہے اور دلیل کے طور پر پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہونے والی بعض روایات کو پیش کرتے ہیں حالانکہ اہلبیت علیہم السلام کے توسط سے نقل ہونے والی احادیث عموماً اس بات کی نفی کرتی ہیں اور خود اہلسنت کے واسطہ سے نقل ہونے والی متعدد معتبر احادیث صریحاً اس کے خلاف ہیں۔

اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ احادیث اہل بیت (ع) کی پیروی کرتے ہوئے شیعہ فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ جوتوں پر مسح کرنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔ لیکن بہت سے اہلسنت فقہاء نے اس کام کو سفر اور حضر میں بطور مطلق جائز قرار دیا ہے اگرچہ بعض علماء نے اسے ضرورت کے مقامات میں منحصر کیا ہے۔

۱) سورۃ بقرۃ آیہ ۲۰۴۔

۲) ابن ابی الحدید معتزلی طبق نقل منتھی المقال شرح حال "سمرۃ"۔

یہاں پر چند سوالات سامنے آتے ہیں، من جملہ:

۱۔ پاؤں پر مسح کرنا تو جائز نہیں تھا کسی طرح جوتوں پر مسح کرنا جائز ہوگیا ہے حالانکہ جب پاؤں دھونے کی بات آتی تھی تو دلیل یہی تھی کہ پاؤں چونکہ آلودہ ہوتے ہیں اس لیے انہیں دھونا بہتر اور مسح کرنا کافی نہیں ہے۔

کیا آلودہ جوتوں پر مسح کرلینا پاؤں دھونے کا قائم مقام بن سکتا ہے۔

جبکہ بہت سے علماء اہلسنت اس بات کے قائل ہیں کہ پاؤں دھونے اور جوتوں پر مسح کرنے میں اختیار ہے۔

۲: کیوں علماء نے قرآن مجید کے ظہور کو ترک کردیا ہے جس میں سر اور پاؤں کے مسح کا حکم تھا اور جوتوں پر مسح کو ترجیح دی ہے؟

۳: کیوں علمائے اہلسنت، روایات اہلبیت سے چشم پوشی کرتے ہیں جس میں بالاتفاق جوتوں پر مسح کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور پیغمبر اکرمؐ نے اہلبیت کو ہی قرآن مجید کے ساتھ باعث نجات شمار کیا ہے؟

۴: درست ہے (برادران کی کتب میں) بعض روایات نقل ہوئی ہیں جن میں بیان ہوا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے جوتوں پر مسح کیا ہے لیکن اس کے مقابلے میں دیگر معتبر روایات بھی موجود ہیں جن میں ذکر کیا گیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ پاؤں پر مسح کیا کرتے تھے۔ روایات کے تعارض اور تضاد کے وقت کیوں علمائے اہلسنت قرآن مجید کی طرف رجوع نہیں کرتے اور روایات کے اختلاف کے حل کیلئے اسے حاکم قرار دیتے ہوئے اسے اپنا مرجع قرار نہیں دیتے ہیں۔

اس مسئلہ میں ہم جتنا زیادہ غور و فکر کرتے ہیں ہمارے تعجب میں اضافہ ہوتا ہے۔

کتاب "الفقه علی المذاهب الاربعه" میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ ضرورت اور اضطرار کے وقت جوتوں پر مسح کرنا واجب اور بغیر ضرورت کے جائز ہے اگرچہ پاؤں کا دھونا افضل ہے۔

اس کے بعد "حنابلہ" سے نقل کیا گیا ہے کہ جوتوں پر مسح کرنا اُن کو باہر نکالنے اور پاؤں دھونے سے افضل ہے۔ کیونکہ اس میں رخصت کا اخذ کرنا اور نعمت کا شکر بجالانا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے بعض پیروکاروں نے بھی اس بات کی تائید کی ہے۔(۱)

اس کے بعد اسی کتاب میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ جوتوں پر مسح کرنا بہت سی روایات کے ذریعہ ثابت ہے جو تواتر کے قریب ہیں۔(۲)

قابل توجہ یہ ہے کہ اس کتاب میں جوتوں کے بارے میں مفصل بحث کی گئی ہے کہ ایسے جوتوں کی شرائط کیا ہیں، مسح کی مقدار کیا ہے، مسح کی مدت کتنی ہے (یعنی کتنے دن تک لگاتار جوتوں پر مسح کیا جاسکتا ہے) جوتوں پر مسح کرنے کے مستحبات، مکروہات اور مبطلات کیا ہیں۔ اس طرح اگر ایک جوتے پر دوسرا جوتا پہنا ہو اس کا کیا حکم ہے، جوتے کی جنس کیا ہونی چاہیے کیا ضروری ہے کہ جوتا حتماً چمڑے کا ہو یا اگر چمڑے کے علاوہ کسی اور چیز سے بنایا گیا ہو تو کافی ہے۔

اسی طرح شگاف دار جوتوں اور بے شگاف جوتوں کا کیا حکم ہے؟...... الغرض اس کتاب میں بہت مفصل گفتگو انہی جوتوں کے بارے میں کی گئی ہے۔(۳)

---

۱) الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد ۱، ص ۱۳۵۔
۲) ایضاً، ص ۱۳۶۔
۳) ایضاً، ج ۱، ص ۱۳۵ تا ص ۱۳۷۔

۵: علماء اہلسنت کیوں جوتے پر مسح والی روایات کو ضرورت، سفر اور جنگ کے موارد اور جہاں جوتوں کا اتارنا ممکن نہیں یا بہت ہی مشکل ہے، حمل نہیں کرتے یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب نہیں ہے اور صرف پہلے ہی سے قضاوت کر لینا اس سادہ سے مسئلہ میں شور وغل کا باعث بنا ہے۔

میں نے خود جدہ ائیر پورٹ پر مشاہدہ کیا کہ برادران اہلسنت میں سے ایک آدمی وضو کے لیے آیا اس نے وضو کے دوران اچھی طرح اپنے پاؤں کو دھویا۔ اس کے بعد دوسرا شخص آیا اس نے ہاتھ، منہ دھونے کے بعد جوتوں پر ہاتھ پھیر لیا اور نماز کے لیے چلا گیا میں حیرت میں ڈوب گیا اور سوچنے لگا کہ کیا ممکن ہے کہ پیغمبر اکرمؐ جیسے حکیم کی طرف سے ایسا حکم دیا گیا ہو جس کی توجیہ ممکن نہیں ہے۔

ان سوالات کے بعد ضروری ہے کہ ہم اس مسئلہ کے اصلی مدارک کی تلاش میں جائیں۔ اور روایات کے درمیان سے اس فتوٰی کے اصلی نکتہ اور اسی طرح ایک عقلی راہ حل کو تلاش کریں۔

روایات چند اقسام پر مشتمل ہیں:

الف) جو روایات اہلبیتؑ کے منابع میں نقل ہوئی ہیں وہ عام طور پر بلکہ بالاتفاق جوتے پر مسح کرنے سے منع کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر:

۱۔ شیخ طوسی نے ابوالورد سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام محمد باقرؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ ابوظبیان نقل کرتا ہے کہ میں نے حضرت علیؑ کو دیکھا کہ انہوں نے پانی پھینک دیا اور جوتوں پر مسح کر لیا۔ آپ نے فرمایا ابوظبیان جھوٹ بولتا ہے۔

"أما بلغكم قول عليٍّ فيكم: سبق الكتابُ الخُفّين؟ فقلتُ: هل فيهما رُخصةٌ؟ فقال لا، إلا من عدوٍّ تقيةً أو ثلجٍ تخاف على رجليك"(۱)

کیا تم نے نہیں سنا ہے کہ علیؑ نے فرمایا ہے کتاب خدا (سورۃ مائدہ کی آیت جو پاؤں کے مسح کا حکم دیتی ہے) جوتوں پر مسح کرنے والے حکم پر مقدم ہے میں نے عرض کی کیا جوتوں پر مسح کرنے کے بارے میں کوئی رخصت ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں مگر یہ کہ دشمن کے خوف سے تقیہ کرنا مقصود ہو یا برف باری کی وجہ سے تمہارے پاؤں کو خطرہ ہو۔

اس حدیث سے چند نکات کا استفادہ ہوتا ہے۔

اولاً: حالانکہ اہلسنت کی روایات میں مشہور یہ ہے کہ حضرت علیؑ جوتے پر مسح کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ پھر کس طرح ابوظبیان وغیرہ نے جرأت کی ہے کہ آپ کی طرف جھوٹی نسبت دیں؟ کیا یہ کوئی سازش تھی؟ اس سوال کا جواب ہم بعد میں دیں گے۔

ثانیاً: حضرت علیؑ نے راستہ دکھایا ہے وہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید ہر چیز پر مقدم ہے، کوئی چیز قرآن مجید پر مقدم نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی روایت ظاہری طور پر قرآن مجید کے خلاف ہو تو اس کی توجیہ و تفسیر کرنی چاہیے۔

بالخصوص اگر کوئی روایت سورۃ مائدہ (وہ سورۃ جس میں وضو کا حکم بیان ہوا ہے) کے خلاف ہو کہ اس کی کوئی بھی آیت نسخ نہیں ہوئی ہے۔

(۱) تہذیب الاحکام، جلد ۱، حدیث ۱۰۹۲۔

ثالثاً: امام محمد باقر علیہ السلام نے بھی رہنمائی کی ہے کہ اگر جوتوں پر مسح کے بارے میں کوئی روایت وارد ہوئی ہو تو اسے ضرورت و اضطرار، جیسے شدید سردی کہ جسکی وجہ سے پاؤں کو خطرہ ہو، پر حمل کیا جائیگا۔

۲: مرحوم شیخ صدوق ؒ نے "من لا یحضرہ الفقیہ" میں ایک حدیث میں امیر المومنین ؑ سے نقل کیا ہے کہ آپ ؑ نے فرمایا:

"إنّا اهلُ بيت..... لا نمسح علىٰ الخفين فمن كان من شيعتنا فليقتدِ بنا وليستنّ بسنّتنا" (۱)

کہ ہم خاندان اہلبیت جوتے پر مسح نہیں کرتے ہیں پس جو بھی ہمارا پیروکار ہے ہماری اقتدا کرے اور ہماری سنت کے مطابق عمل کرے۔

۳: ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے عجیب تعبیر نقل ہوئی ہے کہ آپ ؑ نے فرمایا:

"مَن مسح علىٰ الخفين فقد خالف الله و رسوله و كتابهُ و وضوئه لم يتم و صلاته غيرُ مُجزية" (۲)

جس نے جوتے پر مسح کیا، اس نے خدا، رسول اور قرآن مجید کی مخالفت کی، اس کا وضو درست نہیں ہے اور اس کی نماز کفایت کرنے والی نہیں۔

حضرت علی علیہ السلام سے جو روایت جوتوں پر مسح کی ممنوعیت کے بارے میں نقل ہوئی ہے؟

---

۱) من لا یحضرہ الفقیہ، جلد ۳، ص ۳۱۵۔

۲) وسائل الشیعہ، جلد ۱، ص ۲۷۹۔

ہمیں جناب فخر رازی کی اس بات کی یاد دلاتی ہے جو انہوں نے بسم اللہ کے جہر و اخفاء والے مسئلہ میں بیان کی ہے۔ بسم اللہ کے بارے میں کچھ لوگ قائل تھے کہ اس کا آہستہ پڑھنا واجب ہے جبکہ حضرت علی علیہ السلام بسم اللہ کو بالجہر پڑھنا ضروری سمجھتے تھے تو اس پر جناب فخر رازی کہتے ہیں کہ:

"من اتخذ عليًا إماماً لدينه فقد استمسك بالعروة الوثقىٰ في دينه و نفسه" (۱)

جس نے دین میں حضرت علی ؑ کو اپنا پیشوا بنایا تو وہ اپنے دین اور نفس میں عروۃ الوثقی (مضبوط سہارے) سے متمسک ہو گیا ہے۔

لیکن اس کے باوجود ہم دیگر روایات کو بھی ذکر کر دیتے ہیں تا کہ کسی کو اعتراض نہ رہے

ب) جو روایات جوتوں پر مسح کرنے کی اجازت دیتی ہیں وہ دو قسم کی ہیں:

قسم اول: وہ روایات ہیں جو مطلق طور پر اس مسح کی اجازت دیتی ہیں جیسے سعد بن ابی وقاص کی مرفوعہ حدیث جو انہوں نے رسول خدا ؐ سے جوتوں پر مسح کے بارے میں نقل کی ہے کہ

"انه لا بأس بالوضوء علىٰ الخفين" (۲)

ایک دوسری حدیث میں کہ جو بیہقی کی نقل کے مطابق صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حذیفہ سے منقول ہے۔ یوں آیا ہے کہ:

"مشىٰ رسول الله إلىٰ سباطة قوم فبال قائماً ثم

---

۱) تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۱، ص ۲۰۷۔

۲) السنن الکبریٰ، جلد ۱، ص ۲۶۹۔

"دعا بماء فجئته بماء فتوضا و مسح علی خفیه"(۱)

انتہائی معذرت اور شرمندگی کے ساتھ مجبوراً اس حدیث کا ترجمہ کر رہے ہیں

"رسول خداؐ ایک قوم کے کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ گئے اور کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔ اس کے بعد پانی مانگا، میں (حذیفہ) ان کے لیے پانی لیکر گیا۔ آپؐ نے وضو کیا اور جوتوں پر مسح کیا!!"

ہمیں اطمینان ہے کہ یہ حدیث جعلی ہے اور بعض منافقین کی طرف سے رسول خداؐ کے تقدس کو داغدار کرنے کے لیے جعل کی گئی ہے۔ اور اس کے بعد صحیح بخاری اور صحیح مسلم جیسی کتب میں (مصنفین کی سادگی کی وجہ سے) شامل ہو گئی ہے۔

جو شخص تھوڑی سی بھی شخصیت کا مالک ہو، کیا اس قسم کا کام کرتا ہے کہ جس کے بہت سے نا مطلوب لوازم ہوں؟ مقام افسوس ہے کہ صحاح ستہ میں اس قسم کی روایات نقل کی گئی ہیں اور آج تک علماء ان روایات سے استدلال کرتے ہیں۔

بہر حال ان روایات اور اس قسم کی دوسری روایات میں جوتوں پر مسح کو بغیر کسی قید و شرط کے ذکر کیا گیا ہے۔

قسم دوم:

ان روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ جوتوں پر مسح (اگر جائز ہے) تو صرف ضرورت کے مقامات کے ساتھ مخصوص ہے۔ جیسے مقدام بن شریح کی روایت جو انہوں نے حضرت عائشہ سے نقل کی ہے۔ وہ کہتا ہے میں نے حضرت عائشہ سے جوتوں پر مسح کے بارے میں

۱) ایضاً، ص ۲۷۰۔

سوال کیا، انہوں نے کہا حضرت علی علیہ السلام کے پاس جاؤ وہ سفر میں رسول خداؐ کے ہمراہ جاتے تھے میں انکی خدمت میں آیا اور ان سے اس مسئلہ کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا

"کنا اذا سافرنا مع رسول اللہ یامرنا بالمسح علی خفافنا" (۱)

جب ہم رسول خداؐ کے ہمراہ سفر پر جاتے تھے تو آپؐ ہمیں جوتوں پر مسح کرنے کا دستور دیتے تھے"

اس تعبیر سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جوتوں پر مسح کرنے کا مسئلہ ضرورت کے موارد کے ساتھ مربوط تھا۔ اس لیئے فرمایا ہے کہ رسول خداؐ سفر میں یوں دستور دیتے تھے۔ اور اس قسم کی دیگر روایات۔

اہلسنت کے معروف منابع میں ذکر ہونے والی تمام روایات میں (پہلے سے کی جانے والی تضادوت سے چشم پوشی کرتے ہوئے) غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:

اولا: علم اصول کے مشہور قاعدہ (قاعدۂ جمع یعنی مطلق کو مقید کے ذریعے تقیید لگائی جائے) کے مطابق ان روایات کو جو بغیر قید و شرط کے جوتوں پر مسح کو جائز قرار دیتی ہیں، موارد ضرورت و اضطرار پر حمل کیا جائے جیسے سفر یا میدان جنگ میں یا اس قسم کے دیگر مقامات میں۔ اور دلچسپ یہ ہے کہ سنن بیہقی میں ایک مفصل باب جوتوں پر مسح کرنے کی مدت کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے اور چند روایات کے ذریعے اس مدت کو سفر میں تین دن اور حضر وغیرہ میں ایک دن، بیان کیا گیا ہے۔ (۱)

۱) ایضاً، ص ۲۷۲۔
۲) السنن الکبریٰ، جلد ۱، ص ۲۷۵، ۲۷۶۔

کیا یہ ساری روایات، اس حقیقت کیلئے روشن دلیل نہیں ہیں کہ جوتوں پر مسح کے بارے میں جو کچھ روایات میں بیان کیا گیا ہے وہ ضرورت اور اضطرار کے حالات کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور عام حالات میں جوتے نہ اتارنے اور پاؤں پر مسح نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

اور یہ جو بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ اجازت امت سے عسر و حرج کو دور کرنے کیلئے ہے۔ یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔ کیونکہ عام جوتوں کے اتارنے میں ذرہ بھر زحمت نہیں ہے۔

ثانیاً: اہلبیت اور اہلسنت کے معروف منابع میں حضرت علیؑ سے متعدد روایات نقل ہوئی ہیں کہ وہ فرماتے تھے یہ مسح سورۂ مائدہ کی چھٹی آیت کے نزول سے پہلے تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر اجازت تھی بھی تو آیت کے نزول سے پہلے تھی۔ آیت کے نزول کے بعد حتی جنگ اور سفر میں بھی جوتوں پر مسح جائز نہیں تھا۔ کیونکہ جوتے نہ اتار سکنے کی صورت میں اصحاب تیمم کرتے تھے، چونکہ تیمم کا حکم بھی بطور کلی اس آیت کے ذیل میں آیا ہے۔

ثالثاً: اگر بعض اصحاب نے پیغمبر اکرمؐ کو حضر میں جوتوں پر مسح کرتے دیکھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے جوتوں پر شگاف تھا جس میں سے پاؤں پر مسح کرنا ممکن تھا۔

مشہور شیعہ محدث مرحوم صدوق اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''من لا یحضرہ الفقیہ'' میں لکھتے ہیں کہ: نجاشی نے پیغمبر اکرمؐ کو جوتے ہدیہ میں دیے تھے جنکے اوپر شگاف تھا، پیغمبر اکرمؐ نے ایک مرتبہ جوتے پہنے ہوئے اپنے پاؤں پر مسح کیا، بعض ناظرین نے گمان کیا کہ آپؐ نے جوتوں پر مسح کیا ہے۔(۱)

معروف محدث جناب بیہقی نے اپنی کتاب ''السنن الکبریٰ'' میں ایک باب ''باب الخف

۱) من لا یحضرہ الفقیہ، جلد ۱ ص ۲۸۔

الذی مسح علیه رسول الله'' (وہ مخصوص جوتے جن پر رسول خداؐ نے مسح کیا) کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔ اس باب کی بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مہاجرین اور انصار کے جوتے بھی اسی طرح اوپر سے کھلے تھے ''و کانت کذلک خفاف المهاجرین و الأنصار مخرقة مشققة''(۱)

اس بناء پر قوی احتمال ہے کہ وہ اصحاب بھی اپنے پاؤں پر مسح کرتے ہوں۔ اس بحث کے تعجب آور مراحل میں سے ایک یہ ہے کہ جن راویوں نے جوتوں پر مسح والی روایات کو نقل کیا ہے انہیں کبھی کبھار رسول خداؐ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ لیکن حضرت علیؑ کہ جو ہمیشہ آنحضرتؐ کی خدمت میں موجود رہتے تھے؛ اہلسنت کی مشہور روایات کے مطابق؛ اس مسح کے مخالف تھے۔

اس سے زیادہ تعجب آور یہ ہے کہ حضرت عائشہ کہ جو اکثر اوقات آنحضرتؐ کے ہمراہ تھیں فرماتی ہیں:

''لئن تقطع قدمای احب الیّ من ان امسح علی الخفین''(۱)

اگر میرے دونوں پاؤں کٹ جائیں یہ میرے لیے اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ میں اپنے جوتوں پر مسح کروں''

۱) السنن الکبریٰ، جلد ۱ ص ۲۸۳۔
۲) مبسوط سرخسی، جلد ۱ ص ۹۸۔

بحث کا آخری نتیجہ:

۱۔ قرآن مجید نے وضو میں اصلی فریضہ پاؤں کے مسح کو قرار دیا ہے (سورۂ مائدہ آیت ۶) اس طرح اہلبیت علیہم السلام کی تمام روایات اور انکی اتباع کرنے والے تمام امامیہ فقہاء کا فتویٰ بھی اسی آیت کے مطابق ہے:-

۲: اہلسنت کے فقہاء، وضو میں اصلی فریضہ غالباً پاؤں دھونے کو قرار دیتے ہیں لیکن ان میں اکثر اجازت دیتے ہیں کہ اختیاری صورت میں جوتوں پر مسح کیا جاسکتا ہے البتہ ان میں سے بعض اس مسح کو ضرورت کے موارد میں منحصر کرتے ہیں۔

۳: جو روایات اہلسنت کے منابع میں جوتوں پر مسح کے بارے میں ذکر ہوئی ہیں اس قدر متضاد و متناقض ہیں کہ ہر محقق کو شک میں ڈال دیتی ہیں۔ بعض روایات بغیر کسی قید و شرط کے جوتوں پر مسح کی اجازت دیتی ہیں، بعض کلی طور پر منع کرتی ہیں جبکہ بعض ضرورت کے مواقع کے ساتھ مختص کرتی ہیں اور اس کی مقدار سفر میں تین دن اور حضر میں ایک دن بیان کرتی ہیں۔

۴: روایات کے درمیان بہترین جمع کا طریقہ یہ ہے کہ اصلی حکم پاؤں پر مسح کرنا ہے (اور انکے عقیدہ کے مطابق پاؤں دھونا ہے) اور ضرورت و اضطرار کے وقت جیسے جنگ اور دشوار سفر کہ جس میں نعلین کے بجائے بند جوتے (انکی تعبیر کے مطابق خُف) پہنتے تھے اور ان کا اتارنا بہت مشکل تھا جوتوں پر (مسح جبیرہ کی شکل) مسح کرتے تھے۔

۹

بسم اللہ

سورۃ الحمد کا جزء ہے

ایک تعجب آور نکتہ: جب شیعیان اہلبیتؑ خانہ خدا کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں تو اس وحدت کو محفوظ رکھنے کے لیے جس کا حکم ائمہ اہلبیتؑ نے دیا ہے وہ اہلسنت برادران کی نماز جماعت میں شرکت کرتے ہوئے مسجد الحرام اور مسجد النبیؐ میں با جماعت نماز کا ثواب حاصل کرتے ہیں۔ تو اس وقت سب سے پہلی چیز جو انکی توجہ کو اپنی طرف جلب کرتی ہے یہ ہے کہ وہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ امام جماعت سورۃ الحمد کی ابتداء میں یا تو بالکل بسم اللہ پڑھتے نہیں ہیں یا اگر پڑھتے ہیں تو آہستہ اور مخفی انداز میں پڑھتے ہیں حتیٰ کہ مغرب و عشاء کی نماز میں جنھیں با آواز بلند پڑھا جاتا ہے۔

حالانکہ دوسری طرف وہ اس بات کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ موجودہ قرآن مجید کے تمام نسخوں میں کہ جو اکثر مکہ مکرمہ سے شائع ہوتے ہیں سورۃ حمد کی سات آیات ذکر کی گئی ہیں جن میں سے ایک بسم اللہ ہے۔ یہ بات سب کے لیے تعجب کا باعث بنتی ہے کہ قرآن مجید کی سب سے اہم ترین آیت "بسم اللہ" کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا جارہا ہے؟ اور جس وقت لوگ ہم سے سوال کرتے ہیں اور ہم انکے سامنے اس بارے میں اہلسنت کے مذاہب و روایات کے اختلاف کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کے تعجب میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے۔

اس مقام پر ضروری ہے کہ پہلے ہم اس مسئلہ میں موجود فتاویٰ اور اس کے بعد بحث میں وارد ہونے والی مختلف روایات کی طرف رجوع کریں۔

اس مسئلہ میں مجموعی طور پر اہلسنت کے فقہاء تین گروہوں پر مشتمل ہیں۔

۱۔ بعض علما کہتے ہیں کہ سورۂ حمد کی ابتداء میں بسم اللہ پڑھنا چاہیے۔

جہری نمازوں میں بلند آواز کے ساتھ پڑھنا چاہیے اور اخفاتی نمازوں میں آہستہ پڑھنا چاہیے۔ یہ امام شافعی اور انکی پیروی کرنے والے علما ہیں۔

۲۔ بعض علما کہتے ہیں کہ بسم اللہ پڑھی چاہیے لیکن ہمیشہ دل میں یعنی آہستہ پڑھنی چاہیے۔ یہ حنبلی علماء (امام احمد ابن حنبل کے پیروکاروں) کا نظریہ ہے۔

۳۔ ایک گروہ بسم اللہ پڑھنے کو اصلاً ممنوع سمجھتا ہے۔ یہ امام مالک کے پیروکار ہیں۔

امام ابوحنیفہ کے پیروکاروں کی نظر بھی مالکی مذہب والوں کے قریب ہے۔

اہلسنت کے مشہور فقیہ ''ابن قدامہ'' اپنی کتاب مغنی میں یوں رقمطراز ہیں:

"انّ قراءة بسم الله الرحمن الرّحيم مشروعة فی اوّل الفاتحة و اوّل كلّ سورة فی قول اكثر أهل العلم و قال مالک و الأوزاعی لايقرؤها فی اول الفاتحة ...... و لا تختلف الرواية عن احمد ان الجهر بها غير مسنون ...... و يروی عن عطاء و طاووس و مجاهد و سعيد بن جبير الجهر بها و هو مذهب الشافعی ......(۱)

سورۂ حمد اور ہر دوسری سورت کے آغاز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کا پڑھنا اکثر

۱) المغنی ابن قدامہ، جلد ۱، ص ۵۲۱۔

اہلسنت کے نزدیک جائز ہے لیکن مالک اور اوزاعی (اہلسنت کے فقہاء) نے کہا ہے کہ سورۂ حمد کی ابتداء میں بسم اللہ نہ پڑھی جائے (اور بسم اللہ کے بالجہر پڑھنے کے بارے میں) جتنی روایات بھی امام احمد بن حنبل سے نقل ہوئی ہیں سب کی سب کہتی ہیں کہ بسم اللہ کو بالجہر (بلند آواز کے ساتھ) پڑھنا سنت نہیں ہے...... اور عطا، طاووس، مجاہد اور سعید بن جبیر سے روایت نقل ہوئی ہے کہ بسم اللہ کو بالجہر پڑھنا چاہیے اور امام شافعی کا بھی یہی مذہب ہے"

اس عبارت میں انکے تینوں اقوال نقل ہوئے ہیں:

تفسیر ''المنیر'' میں وھبہ زحیلی نے یوں لکھا ہے۔

"قال المالكية و الحنفية ليست البسملة بآية من الفاتحة و لا غيرها الا من سورة النمل...... الا أن الحنفية قالوا يقرء المنفرد بسم الله الرحمن الرّحيم مع الفاتحة فی كلّ ركعة سرّاً...... و قال الشافعية و الحنابلة البسملة آية من الفاتحة يجب قراءتها فی الصلوٰة الا أن الحنابلة قالوا كالحنفية يقرؤ بها سرّاً و لا يجهر بها و قال الشافعية: يسرّ فی الصلوٰة السرّية و يجهر بها فی الصلاة الجهرية(۱)

۱) تفسیر المنیر، جلد ۱، ص ۴۶۔

امام مالک اور ابو حنیفہ کے پیروکار کہتے ہیں کہ بسم اللہ سورہ حمد اور قرآن مجید کی دیگر سورتوں کی جزء نہیں ہے صرف سورہ نمل میں ذکر ہونے والی آیت جو بسم اللہ پر مشتمل ہے سورت کا جزء ہے......

لیکن امام ابو حنیفہ کے پیروکار کہتے ہیں کہ جو شخص فرادی نماز پڑھ رہا ہے وہ ہر رکعت میں صرف سورہ حمد کے ساتھ آہستہ آواز میں بسم اللہ پڑھے...... لیکن امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے پیروکار کہتے ہیں:

کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی ایک آیت ہے اور نماز میں اس کا پڑھنا واجب ہے اس فرق کے ساتھ کہ حنبلی کہتے ہیں کہ بسم اللہ کو آہستہ پڑھا جائے، بالجہر پڑھنا جائز نہیں ہے لیکن شافعی مذہب والے کہتے ہیں کہ اخفاتی نمازوں (ظہر وعصر کی نماز) میں آہستہ پڑھا جائے اور بالجہر نمازوں (مغرب، عشا اور صبح کی نماز) میں بلند آواز سے پڑھا جائے"

ان اقوال میں شافعی مذہب والوں کا قول: شیعہ فقہا کے نظریہ سے نزدیک ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ ہمارے علماء تمام نمازوں میں بسم اللہ کو بالجہر پڑھنا مستحب سمجھتے ہیں اور سورۂ حمد میں بسم اللہ پڑھنے کو متفقہ طور پر واجب سمجھتے ہیں اور دیگر سورتوں میں مشہور ومعروف قول بسم اللہ کا جزء سورہ ہونا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ایک غیر جانبدار محقق واقعاً حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔

چونکہ وہ دیکھتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے پورے ۲۳ سال اپنی اکثر نمازوں کو جماعت کے ساتھ اور سب کے سامنے پڑھا۔ اور سب اصحاب نے آنحضرت کی نمازوں کو اپنے کانوں

سے سنا لیکن تھوڑا سا عرصہ گزرنے کے بعد اتنا شدید اختلاف پیدا ہوگیا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ بسم اللہ کا پڑھنا اصلاً ممنوع ہے جبکہ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ اسکا پڑھنا واجب ہے، ایک گروہ کہتا ہے کہ آہستہ پڑھا جائے جبکہ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ جہری نمازوں میں بلند آواز سے پڑھنا چاہیے۔

کیا اس عجیب اور ناقابل یقین اختلاف سے اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ عادی نہیں ہے بلکہ اس مسئلہ کی پشت پر ایک سیاسی گروہ کا ہاتھ ہے، جس نے متضاد احادیث کو جعل کیا اور انہیں رسالتمآب کی طرف نسبت دے دی ہے۔

امام بخاری نے صحیح بخاری میں ایک حدیث نقل کی ہے جو اس راز سے پردہ اٹھاتی ہے وہ کہتے ہیں: مطرف نے "عمران بن حصین" سے نقل کیا ہے کہ جب اس نے بصرہ میں حضرت علیؑ کے پیچھے نماز پڑھی، تو کہا

"ذكرنا هذا الرجل صلاة كنا نصليها مع رسول الله"

اس مرد نے اپنی نماز کے ذریعہ ہمیں رسول اللہ کی اقتداء میں پڑھی ہوئی نمازوں کی یاد دلا دی ہے۔(۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز حتی نماز بھی تبدیل ہوگئی تھی امام شافعی مشہور کتاب "الام" میں "وہب بن کیسان" سے نقل کرتے ہیں کہ "كل سنن رسول الله قد غيرت حتى الصلاة" پیغمبر اکرم کی تمام سنتوں حتی نماز کو تبدیل کر دیا گیا(۲)

---

۱) صحیح بخاری ج۱ص۱۹۰۔

۲) الام، جلد۱ص۲۶۹۔

بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھنے کے بارے میں احادیث نبوی

اس مسئلہ کے بارے میں اہلسنت کی معروف کتب میں مکمل طور پر مختلف اقسام کی احادیث نقل ہوئی ہیں۔ یہی احادیث انکے فتاویٰ میں اختلاف کا سبب بنی ہے اور عجیب یہ ہے کہ کبھی ایک ہی شخص راوی نے متضاد روایات نقل کی ہیں۔ جنکے نمونے آپ آئندہ احادیث میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

پہلی قسم کی احادیث:

اس قسم میں وہ روایات ہیں جو نہ صرف بسم اللہ کو سورہ حمد کا جزء شمار کرتی ہیں بلکہ بلند آواز میں پڑھنے کو بھی مستحب (یا ضروری) قرار دیتی ہیں اس گروہ میں ہم پانچ مشہور راویوں کی پانچ احادیث پر اکتفاء کرتے ہیں:

۱۔ یہ حدیث امیر المومنین علیؑ سے نقل ہوئی ہے۔ انکا مقام ومنزلت سب پر عیاں ہیں کہ وہ جلوت وخلوت اور سفر وحضر میں رسول خداؐ کے ساتھ رہے ہیں۔ دار قطنی نے اپنی کتاب سنن میں آپؑ سے اس حدیث کو نقل کیا ہے کہ

"کان النبی یجھر بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم فی السورتین جمیعاً" (۱)

پیغمبر اکرمؐ دو سورتوں (حمد اور بعد والی سورت) میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بلند آواز سے پڑھتے تھے"

---

۱) سنن دار قطنی، جلد ۱ص ۳۰۲، اسی حدیث کو سیوطی نے در المنثور میں جلد ۱ص ۲۲ پر نقل کیا ہے۔

۲۔ یہ روایت انس بن مالک سے نقل ہوئی ہے کہ جو پیغمبر اکرمؐ کے خصوصی خادم اور جوانی سے ہی آپ کی خدمت میں پہنچ گئے تھے۔ حاکم نے مستدرک میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"صلیت خلف النبی و خلف ابی بکر و خلف عمر و خلف عثمان و خلف علی کلھم کانوا یجھرون بقرائۃ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم" (۱)

۳۔ حضرت عائشہ عام طور پر شب وروز پیغمبر اکرمؐ کے ہمراہ تھیں۔ دار قطنی کی روایت کے مطابق وہ فرماتی ہیں کہ:

"ان رسول اللّٰہ کان یجھر بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم" (۲)

رسول خداؐ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بلند آواز کے ساتھ پڑھتے تھے"

۴۔ اہلسنت کے معروف راوی جناب ابو ہریرہ کہ جن کی بہت سی روایات کو صحاح ستہ میں نقل کیا گیا ہے یوں کہتے ہیں" کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ یجھر بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم فی الصلوۃ" کہ رسولخداؐ نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بلند آواز کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

---

۱) مستدرک الصحیحین، جلد ۱ص ۲۳۲، میں نے رسولخداؐ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی کے پیچھے نماز پڑھی ہیں سب کے سب بسم اللہ کو بلند آواز کے ساتھ پڑھتے تھے۔ مترجم

۲) در المنثور، جلد ۱ص ۲۳۔

یہ حدیث تین معروف کتب "السنن الکبری" (١) "مستدرک حاکم" (٢) اور "سنن دار قطنی" (٣) میں نقل ہوئی ہے۔

۵۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ جبرائیل امین نے بھی پیغمبر اکرم کو نماز کی تعلیم دیتے وقت بسم اللہ کو بلند آواز کے ساتھ پڑھا۔ دار قطنی کی نقل کے مطابق نعمان بن بشیر یوں کہتے ہیں "أمّني جبرئيل عند الكعبة فجهر بسم الله الرحمن الرحيم" جبرائیل امین نے خانہ کعبہ کے پاس میری امامت کی (مجھے نماز پڑھائی) اور بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھا (۴)

دلچسپ یہ ہے کہ بعض معروف علماء نے بسم اللہ بالجہر پڑھنے والی احادیث کو نقل کرنے کے ساتھ یہ تصریح کی ہے کہ ان احادیث کے راوی عام طور پر ثقہ ہیں جیسے حاکم نے مستدرک میں اس بات کی تصریح کی ہے۔

یہاں ہمیں اس بات کا اضافہ کرنا چاہیے کہ کتب اہلبیت علیہم السلام کی فقہ و حدیث کی کتب میں بسم اللہ کو سورۃ حمد کی ایک آیت شمار کیا گیا ہے اور اس بارے میں احادیث تقریباً متواتر ہیں اور اسی طرح بہت سی احادیث میں بسم اللہ کو بالجہر پڑھنے کے بارے میں تصریح کی گئی ہے۔

ان روایات کے بارے میں مزید آگاہی کے لیے کتاب "وسائل الشیعہ" میں "نماز میں قراءت" والے ابواب میں سے باب نمبر ۱۱، ۱۲، ۲۱، ۲۲ کی طرف رجوع کیا جائے۔ وہاں دسیوں

١) السنن الکبری بیہقی جلد ۲ ص ۴۷۔
٢) مستدرک الصحیحین جلد ١ ص ٢٠٨۔
٣) دار قطنی جلد ١ ص ٣٠٦۔
۴) سنن دار قطنی جلد ١ ص ٣٠٩۔

روایات آئمہ اہلبیت سے نقل کی گئی ہیں اور دیگر معتبر کتب جیسے کافی، عیون اخبار الرضا، اور مستدرک الوسائل میں (نماز میں قراءت قرآن کے مربوطہ ابواب میں) بھی بہت سی روایات ذکر کی گئی ہیں۔

حدیث ثقلین کی روشنی میں کہ جسے فریقین نے نقل کیا ہے اور اس میں حکم دیا گیا ہے کہ میرے بعد قرآن مجید اور میرے اہلبیت کا دامن تھام کر رکھنا تا کہ گمراہی سے بچے رہو۔ کیا ہمیں اس قسم کے اختلاف انگیز مسئلہ میں مذہب اہلبیت کی پیروی نہیں کرنا چاہیے (تا کہ گمراہی سے محفوظ رہیں)!؟

دوسری قسم کی احادیث:

یہ قسم ان احادیث پر مشتمل ہے جو بسم اللہ کو سورۃ حمد کا جزء شمار نہیں کرتیں یا بسم اللہ کو بلند آواز کے ساتھ پڑھنے سے منع کرتی ہیں۔

۱۔ یہ حدیث صحیح مسلم میں قتادہ سے نقل ہوئی ہے جس میں انس کہتے ہیں کہ:

"صليت مع رسول الله (ص) و ابي بكر و عمر و عثمان فلم اسمع احداً منهم يقرء بسم الله الرحمن الرحيم" (١)

میں نے رسول خدا، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کے ساتھ نماز پڑھی میں نے کسی سے نہیں سنا کہ انہوں نے نماز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھی ہو"

١) صحیح مسلم جلد ۲، "باب حجة من قال لا يجهر بالبسملة" ص ١٢۔

توجہ کرنی چاہیے کہ اس حدیث میں حضرت علیؑ کی قراءت کے بارے میں کوئی بات نہیں کی گئی ہے!

واقعاً تعجب آور ہے کہ ایک معین شخص جیسے انس ایک مرتبہ کہتے ہیں کہ میں نے رسولخداؐ، خلفائے ثلاثہ اور حضرت علیؑ کے پیچھے نماز پڑھی۔ سب کے سب بسم اللہ کو بلند آواز کے ساتھ پڑھتے تھے۔ دوسری جگہ وہی کہتے ہیں کہ میں نے رسولخداؐ اور خلفائے ثلاثہ کے پیچھے نماز پڑھی کسی نے بھی نماز میں بسم اللہ نہیں پڑھی چہ جائیکہ بلند آواز سے پڑھتا۔

کیا ہر صاحب فہم یہاں یہ سوچنے پر مجبور نہیں ہوتا کہ پہلی حدیث کو بے اثر کرنے کے لیے جاعلین حدیث نے (جیسا کہ عنقریب بیان کیا جائیگا) اس دوسری حدیث کو جعل کیا ہے اور اسے انس کی طرف نسبت دی ہے اور چونکہ حضرت علیؑ کا بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھنا مشہور ہے اور انکے پیروکار جہاں کہیں بھی ہیں یہی کام کرتے ہیں اس لیے ان کا نام نہیں لیا گیا ہے تا کہ ذحول کا پول نہ کھل جائے؟

۲۔ سنن بیہقی میں عبداللہ بن مغفل سے نقل ہوا ہے، وہ کہتے ہیں:

"سمعنی أبی و أنا أقرأ بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم فقال: أی بنیّ محدث؟ صلیت خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و أبی بکر و عمر و عثمان فلم أسمع أحداً منھم جھر بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم" (۱)

---

۱) السنن الکبریٰ، جلد ۲، ص ۵۲۔

میرے والد نے مجھے نماز میں بسم اللہ پڑھتے سنا تو کہنے لگے: کیا بدعت ایجاد کرنا چاہتے ہو؟ میں نے رسولخداؐ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کے پیچھے نماز پڑھی ان میں سے کسی کو میں نہیں دیکھا کہ بسم اللہ کو بلند آواز کے ساتھ پڑھتا ہو"۔

اس حدیث میں بھی حضرت علی علیہ السلام کی نماز کا تذکرہ نہیں ہوا ہے

۳۔ جناب طبرانی کی کتاب "المعجم الوسیط" میں ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ:

"کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ اذا قرء بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ھزء منہ المشرکون و قالوا محمد یذکر الہ الیمامۃ. و کان مسیلمۃ یسمی "الرّحمٰن" فلمّا نزلت ھذہ الآیۃ امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ ان لا یجھر بھا؟

کہ رسولخداؐ جب نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے تھے تو مشرکین تمسخر کرتے تھے۔ کیونکہ یمامہ کی سرزمین پر خدائی کا دعویٰ کرنے والے مسیلمہ کا نام رحمٰن تھا۔ اس لیے مشرکین کہتے تھے کہ محمدؐ کی مراد وہی یمامہ کا خدا ہے۔ اس وجہ سے پیغمبر اکرمؐ نے حکم دے دیا تھا کہ اس آیت کو بلند آواز سے نہ پڑھا جائے"

اس حدیث میں جعلی ہونے کے آثار بالکل نمایاں ہیں کیونکہ:

اولاً: رحمٰن کا کلمہ قرآن مجید میں صرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں نہیں آیا ہے بلکہ اور بھی ۵۶ مقامات پر ذکر ہوا ہے۔ صرف سورۂ مریم میں ہی اس کا سولہ ۱۶ مرتبہ تکرار ہوا ہے۔ اگر

یہی وجہ ہے تو قرآن مجید کی دوسری سورتوں کو بھی نہیں پڑھنا چاہیے، کہیں مشرکین مسلمانوں کا مذاق نہ اڑائیں۔

ثانیاً: مشرکین تو قرآن مجید کی تمام آیات کا تمسخر کرتے تھے جیسا کہ متعدد آیات میں اس بات کا تذکرہ کیا گیا ہے من جملہ سورہ نساء کی چالیس نمبر آیت "اذا سمعتم آیات اللہ یکفر بھا و یستھزأ بھا فلا تقعدوا معھم"

مشرکین نماز کے لیے دی جانے والی اذان کا بھی مذاق اڑاتے تھے جیسے سورہ مائدہ کی ۵۸ نمبر آیت میں تذکرہ ہوا ہے "و اذا نادیتم الی الصلوٰۃ اتخذوھا ھزواً" کیا پیغمبر اکرمؐ نے اذان کے ترک کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔ یا اذان آہستہ کہنے کا حکم دیا ہے کہ کہیں مشرکین مذاق نہ اڑائیں۔

بنیادی طور پر مشرکین خود پیغمبر اکرمؐ کا استہزاء کرتے تھے جیسا کہ اس آیت میں تذکرہ ہوا ہے "و اذا رآک الذین کفروا ان یتخذونک الا ھزواً" (۱)

اگر یہی دلیل ہے تو خود پیغمبر اکرمؐ کو لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ ہو جانا چاہیے تھا۔

ان سب ادلہ سے قطع نظر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو بڑی صراحت کے ساتھ وعدہ دیا تھا کہ آپؐ کو استہزا کرنے والوں کے شر سے محفوظ رکھے گا "انا کفیناک المستھزئین" (۲)

ثالثاً: مسیلمہ کوئی ایسی شخصیت نہیں تھا جس کو اسقدر اہمیت دی جاتی کہ پیغمبر اکرمؐ اس کا نام

۱) سورۃ انبیاء آیت ۳۶۔
۲) سورۃ حجرات آیت ۹۵۔

رحمٰن ہونے کی وجہ سے قرآن مجید کی آیات کو مخفی کرتے یا آہستہ پڑھتے۔ خاص طور پر اس بات کیطرف بھی توجہ رہے کہ مسیلمہ کے دعوے ہجرت کے دسویں سال منظر عام پر آئے تھے اور اس وقت اسلام مکمل طور پر قوت اور قدرت پیدا کر چکا تھا۔

ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث گھڑنے والے اپنے کام میں مہارت نہیں رکھتے تھے اور نا آگاہ تھے۔

۴: ابن ابی شیبہ نے اپنی کتاب "مصنف" میں ابن عباس سے نقل کیا ہے "الجھر ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرائۃ الأعراب" بسم اللہ کو بلند آواز کے ساتھ پڑھنا عرب کے بدوؤں کی عادت تھی" (۱)

حالانکہ ایک اور حدیث میں علی ابن زید بن جدعان نے بیان کیا ہے کہ "عبادلہ" (یعنی عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن عمر اور عبداللہ ابن زبیر) تینوں بسم اللہ کو بلند آواز کے ساتھ پڑھتے تھے" (۲)

اس سے بڑھ کر حضرت علی علیہ السلام بسم اللہ کو ہمیشہ بالجہر پڑھتے تھے۔ یہ بات تمام شیعہ وسنی کتب میں مشہور ہے کیا علی علیہ السلام بیابانی اعراب میں سے تھے؟! کیا ان متضاد احادیث کا وجود انکے سیاسی ہونے کی دلیل نہیں ہے؟

ہاں! حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام ہمیشہ بسم اللہ کو بالجہر پڑھتے تھے۔ جب امیر المومنین کی شہادت اور امام حسن علیہ السلام کی مختصر سی خلافت کے بعد معاویہ کے ہاتھ میں حکومت

۱) مصنف ابن ابی شیبہ، جلد ۲ ص ۸۹۔
۲) الدر المنثور، جلد ۱ ص ۲۱۔

کی باگ ڈور آ گئی، تو اس کی پوری کوشش یہ تھی کہ تمام آثار علوی کو عالم اسلام کے صفحہ سے مٹا دے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مسلمانوں میں آپ کے فکری اور معنوی افکار کا نفوذ اس کی سلطنت کے لیے خطرہ ہے۔

اس بات کا منہ بولتا ثبوت اس حدیث میں ملتا ہے جسے حاکم نے مستدرک میں نقل کیا اور معتبر قرار دیا ہے (پیغمبر اکرمؐ کے خصوصی خادم) جناب انس بن مالک فرماتے ہیں کہ معاویہ مدینہ میں آیا اس نے جہری نماز (مغرب، عشاء و یا صبح کی نماز) میں سورۃ الحمد سے پہلے بسم اللہ کو پڑھا لیکن بعد والی سورت میں نہیں پڑھا۔ جب نماز ختم کی تو ہر طرف سے مہاجرین و انصار کی (کہ جو شاید جان بچانے کی خاطر نماز میں شریک ہوئے تھے) صدائیں بلند ہوگئیں "اسرقت الصلوۃ ام نسیت؟!" کہ تو نے نماز میں سے چوری کی ہے یا بھول گیا ہے؟! معاویہ نے بعد والی نماز میں سورۂ حمد سے پہلے اور بعد والی سورت سے پہلے بھی بسم اللہ پڑھی"(۱)

معاویہ گویا اس بات کے ذریعے مہاجرین و انصار کو آزمانا چاہتا تھا کہ یہ لوگ بسم اللہ اور اس کے بالجہر پڑھنے کے سلسلہ میں کتنی توجہ و سنجیدگی رکھتے ہیں۔ لیکن اس نے اپنا کام شام اور دیگر علاقوں میں جاری رکھا۔

مابین الدفتین قرآن ہے:

یقیناً جو کچھ قرآن کی دو جلد کے درمیان ہے وہ قرآن مجید کا جزء ہے۔ یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ بسم اللہ قرآن مجید کا جزء نہیں ہے صرف سورتوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے

۱) مستدرک الصحیحین، جلد ۱، ص ۲۳۳۔

کے لیے ہے۔ اولاً یہ بات سورۂ حمد کے بارے میں صحیح نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ قرآن مجید کے تمام نسخوں میں آیات کے نمبر لگائے گئے ہیں۔ بسم اللہ کو سورہ حمد کی آیت شمار کیا گیا ہے۔

ثانیاً: یہ سورتوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والا کام کیوں سورہ براءۃ میں نہیں کیا گیا ہے۔ اور اگر جواب میں کہا جائے کہ چونکہ اس سورت کا سابقہ سورۃ (سورۃ انفال) کے ساتھ رابطہ ہے تو یہ بات کسی صورت میں بھی قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اتفاقاً سورۂ انفال کی آخری آیات اور سورہ براءۃ کی ابتدائی آیات کے درمیان کوئی مفہومی رابطہ نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں اور کئی سورتیں ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ارتباط رکھتی ہیں لیکن بسم اللہ نے انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔

حق یہ ہے کہ کہا جائے بسم اللہ ہر سورہ کا جزء ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کا ظاہر بھی اس بات کی خبر دیتا ہے۔ اور اگر سورۂ توبہ میں بسم اللہ کو ذکر نہیں کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے اس سورت کا آغاز پیمان شکن دشمنوں کے ساتھ اعلان جنگ کے ذریعے ہوتا ہے اور اعلان جنگ، رحمٰن اور رحیم کے نام کے ساتھ سازگاری نہیں رکھتا ہے کیونکہ یہ نام رحمت عامّہ اور رحمت خاصۂ الٰہی کی حکایت کرتا ہے۔

بحث کا خلاصہ:

۱۔ پیغمبر اکرمؐ سورۂ حمد اور دیگر تمام سورتوں کی ابتدا میں بسم اللہ پڑھتے تھے (ان کثیر روایات کے مطابق جو آپؐ کے نزدیک ترین افراد سے نقل ہوئی ہیں) اور متعدد روایات کے مطابق آپ بسم اللہ کو بالجہر پڑھا کرتے تھے۔

۲۔ سابقہ روایات کے مقابلے میں جو روایات کہتی ہیں کہ بسم اللہ اصلاً قرآن مجید کا جزء

نہیں ہے یا آنحضرتؐ ہمیشہ اسے بالاخفات پڑھتے تھے۔ مشکوک ہیں بلکہ خود ان روایات میں ایسے قرائن موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ روایات جعلی اور ان کے پیچھے بنوامیہ کی پراسرار سیاستیں ہیں۔ کیونکہ یہ بات مشہور تھی کہ حضرت علی علیہ السلام بسم اللہ کو بالجہر پڑھتے ہیں اور یہ تو معلوم ہے کہ جو کچھ بھی حضرت علیؑ کی خصوصیت یا علامت شمار ہوتی تھی (اگرچہ وہ پیغمبر اکرمؐ سے حاصل کی ہوئی ہوتی تھی) بنوامیہ اس کی شدت کے ساتھ مخالفت کرتے تھے یہ موضوع اس شدید اعتراض کے ذریعے آشکار ہو جاتا ہے کہ جو اصحاب نے معاویہ پر کیا۔ اور اس کے علاوہ بھی قرائن وشواہد موجود ہیں جنہیں ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے۔

۳۔ ائمہ اہلبیت علیہم السلام کا امیر المومنینؑ (کہ انہوں نے سالہا سال پیغمبر اکرمؐ سے بسم اللہ کو بالجہر ادا کرنے کا درس لیا تھا) کی پیروی کرتے ہوئے اس بات پر اتفاق ہے۔ یہاں تک کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اجتمع آل محمد صلی اللہ علیہ و آلہ علیٰ الجھر ببسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم"(۱)

کہ آل محمدؐ کا بسم اللہ کے بلند پڑھنے پر اتفاق ہے"

حداقل اس قسم کے مسائل میں حدیث ثقلین پر عمل کرتے ہوئے روایات اہلبیتؑ کیطرف توجہ کرنی چاہیے اور تمام اہلسنت فقہاء کو چاہیے کہ امام شافعی کی طرح حداقل جہری نمازوں میں بسم اللہ کو بالجہر پڑھنا واجب قرار دیں۔

۴۔ حسن اختتام کے عنوان سے اس بحث کے آخر پر دو باتیں جناب فخر رازی صاحب "تفسیر الکبیر" سے نقل کرتے ہیں:

۱) مستدرک الوسائل، جلد ۴، ص ۱۸۹۔

وہ کہتے ہیں کہ:

"ان علیا - کان یبالغ فی الجھر بالتسمیۃ فلما وصلت الدولۃ الیٰ بنی امیہ بالغوا فی المنع من الجھر سعیاً فی ابطال آثار علی -"(۱)

حضرت علی علیہ السلام بسم اللہ کے بالجہر پڑھنے پر اصرار کرتے تھے، جب حکومت، بنوامیہ کے ہاتھ آئی تو انہوں نے بسم اللہ کے بلند پڑھنے سے منع کرنے پر اصرار کیا تاکہ حضرت علی علیہ السلام کے آثار کو مٹایا جا سکے"

اہلسنت کے اس عظیم دانشمند کی گواہی کے ذریعے بسم اللہ کے آہستہ پڑھنے یا اس کے حذف کرنے والے مسئلہ کا سیاسی ہونا اور زیادہ آشکار ہو جاتا ہے۔ اسی کتاب میں ایک اور مقام پر جناب فخر رازی، مشہور محدث بیہقی سے اس بات کو نقل کرنے کے بعد کہ حضرت عمر ابن خطاب، جناب ابن عباس، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر سب کے سب بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھتے تھے اس بات کا اضافہ کرتے ہیں:

"اما أنّ علی ابن ابی طالب کان یجھر بالتسمیۃ فقد ثبت بالتواتر و من اقتدیٰ فی دینہ بعلی ابن ابی طالب فقد اھتدیٰ، و الدلیل علیہ قول رسول اللہ اللھم أدر الحق مع علی حیث دار، (۲)

۱) تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۱، ص ۲۰۶۔

۲) ایضاً ص ۲۰۴ و ۲۰۵۔

بہر حال حضرت علیؑ بسم اللہ کو بالجہر پڑھتے تھے یہ بات تواتر کے ذریعہ ثابت ہے اور جو بھی دین میں حضرت علیؑ کی پیروی کریگا یقیناً ہدایت پا جائیگا۔ اس بات کی دلیل رسولخداؐ کی یہ حدیث ہے کہ بارالٰہا حق کو ہمیشہ علیؑ کے ساتھ رکھ اور حق کو اسی طرف پھیر دے جس طرف علیؑ رخ کرے"

۱۰

اَولیائے الٰہی سے توسّل

"توسل" قرآنی آیات اور عقل کے آئینہ میں:

بارگاہ الٰہی میں اولیائے الٰہی سے توسل کے ذریعہ مادّی اور معنوی مشکلات حل کرانے کا مسئلہ، وہابیوں اور دیگر مسلمانوں کے درمیان ایک اہم ترین اور متنازعہ مسئلہ ہے۔ وہابی صراحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ نیک اعمال کے ذریعے توسل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اولیائے الٰہی کے ساتھ توسل کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ لوگ اسے ایک قسم کا شرک سمجھتے ہیں۔ جبکہ دنیا کے دوسرے مسلمان اس توسل کو (جس کے مفہوم کی ہم وضاحت کریں گے) جائز سمجھتے ہیں۔

وہابیوں کا گمان یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات اس توسل سے منع کرتی ہیں اور اسے شرک قرار دیتی ہیں۔ من جملہ یہ آیت کریمہ

"ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ" (۱)

یہ آیت فرشتوں کی مانند معبودوں کے بارے میں ہے کہ جن کے لیے مشرکین کہتے تھے "کہ ہم اس لیے ان کی پوجا کرتے ہیں تاکہ یہ ہمیں خدا کے نزدیک کریں" اور اس بات کو

---

(۱) سورۂ زمر آیہ ۳۔

قرآن مجید نے شرک قرار دیا ہے۔ ایک اور آیت میں یوں ارشاد رب العزت ہے "فلا تدعوا مع اللہ احداً" خدا کے ساتھ کسی کو نہ پکارو" (۱)

ایک دوسری روایت میں یوں بیان کیا گیا ہے " والذین یدعون من دونه لا یستجیبون لهم بشیء" جو غیر خدا کو پکارتے ہیں، وہ انکی کوئی حاجت پوری نہیں کر سکتے ہیں" (۲)

وہابیوں کا توہم اور خیال یہ ہے کہ یہ آیات اولیائے الٰہی کے ساتھ توسل کرنے کی نفی کر رہی ہیں۔

اس کے علاوہ وہ ایک اور بات بھی کرتے ہیں وہ یہ کہ بالفرض اگر بعض روایات کی روشنی میں پیغمبر اکرم کی زندگی میں اُن سے توسل جائز ہو لیکن وفات کے بعد ان سے توسل کے جواز پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

یہ وہابیوں کے دعووں کا خلاصہ تھا لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ اسی قسم کی بے دلیل باتوں کی خاطر وہابیوں نے بہت سے مسلمانوں پر شرک اور کفر کی تہمتیں لگائیں اور ان کے خون بہانے کو مباح قرار دیا ہے، اسی طرح انکے مال کو مباح جانا ہے۔ اسی بہانے بہت سا خون بہایا گیا اور بہت سا مال غارت کیا گیا ہے۔

اس وقت جبکہ ہم انکے عقیدہ کو سمجھ چکے ہیں بہتر ہے کہ اصل مسئلہ کی طرف لوٹ کر اسی توسل کے مسئلہ کو بنیادی طور پر حل کریں۔

---

۱) سورۂ جن، آیہ ۱۸۔

۲) سورۂ رعد، آیہ ۱۴۔

سب سے پہلے ہم "توسل" کو لغت، آیات اور روایات کی روشنی میں دیکھتے ہیں: سب میں "توسل" وسیلہ کے انتخاب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور وسیلہ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو انسان کو کسی دوسرے سے قریب کرے

لغت کی مشہور کتاب "لسان العرب" میں توسل کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

"وَصَل الی اللہ وسیلةً اذا عَمِل عملاً تقرب الیه والوسیلة ما یتقرّب به الی الغیر، خدا کی طرف توسل کرنا اور وسیلہ منتخب کرنا یہ ہے کہ انسان ایسا عمل انجام دے جس سے اسے خدا کا قرب نصیب ہو، اور وسیلہ اس چیز کے معنی میں ہے جس کے ذریعے انسان دوسری چیز سے نزدیک ہوتا ہے"

مصباح اللغۃ میں بھی یوں ہی بیان کیا گیا ہے: " الوسیلة ما یتقرّب به الی الشیء والجمع الوسائل" وسیلہ اس شے کو کہتے ہیں جس کے ذریعے، انسان دوسری شے یا شخص کے نزدیک ہوتا ہے اور وسیلہ کی جمع "وسائل" ہے۔

مقاییس اللغۃ میں یوں بیان کیا گیا ہے: " الوسیلة الرغبة و الطلب" وسیلہ رغبت اور طلب کے معنی میں ہے"۔

ان لغت کی کتب کے مطابق، وسیلہ، تقرب حاصل کرنے کے معنی میں بھی ہے اور اس چیز کے معنی بھی ہے جس کے ذریعے انسان دوسری شے کا قرب حاصل کرتا ہے۔ اور یہ ایک وسیع مفہوم ہے

اب ہم قرآن مجید کی آیات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں وسیلہ کی اصطلاح دو آیات میں استعمال ہوئی ہے۔

۱۔سورۂ مائدہ کی ۳۵ویں آیت میں یوں ارشاد ہے:

"یا ایها الذین آمنوا اتقوا اللّٰه و ابتغوا الیه الوسیلة و جاهدوا فی سبیله لعلکم تفلحون"

اس آیت میں تمام اہل ایمان کو مخاطب قرار دیا گیا ہے اور تین دستور بیان کیے گئے ہیں۔

اوّل تقویٰ کا حکم، دوم، وسیلہ منتخب کرنے کا حکم، وہ وسیلہ جو ہمیں خدا سے نزدیک کرے۔ سوم: راہ خدا میں جہاد کرنے کا حکم، ان مجموعہ صفات (تقویٰ، توسّل اور جہاد) کا نتیجہ وہی چیز ہے جسے آیت کے آخر میں بیان کیا گیا ہے: "لعلکم تفلحون" یعنی یہ صفات تمہاری فلاح اور رستگاری کا باعث ہیں"

۲۔سورۂ اسراء کی آیت ۵۷ میں وسیلہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ آیت ۵۷ کے معنی کو سمجھنے کے لیے ہمیں پہلے آیت ۵۶ کا مطالعہ کرنا چاہیے جس میں یوں ارشاد ہے

"قل ادعوا الذین زعمتم من دونه فلا یملکون کشف الضرّ عنکم و لا تحویلاً"

اے پیغمبر: کہہ دیجئے کہ خدا کے علاوہ تم جنہیں پکارتے ہو اور انہیں اپنا معبود تصور کرتے ہو انہیں پکار کر دیکھ لو کہ وہ تمہاری مشکل کو حل کریں، وہ تمہاری کوئی مشکل حل نہیں کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی تبدیلی لا سکتے ہیں"

"قل ادعوا الذین" والے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں معبودوں سے مراد بت یا اس قسم کی کوئی اور چیز نہیں ہے، کیونکہ کلمۂ الذین صاحب شعور اور صاحب عقل افراد کے

لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس آیت میں وہ فرشتے مراد ہیں جنہیں لوگ پوجتے تھے یا حضرت عیسیٰ مراد ہیں کہ ایک گروہ معبود کے عنوان سے انکی پرستش کرتا تھا۔ یہ آیت بیان کر رہی ہے کہ نہ فرشتے اور نہ ہی حضرت عیسیٰ تمہاری مشکل کو حل کر سکتے ہیں۔

بعد والی آیت میں یوں ارشاد ہے "اولئک الذین یدعون یبتغون الی ربهم الوسیلة؛ خود یہ لوگ (فرشتے اور حضرت عیسیٰ) وہ ہیں جو خداوند کی بارگاہ میں وسیلہ کے ذریعہ تقرب حاصل کرتے ہیں وہ وسیلہ کہ ایهم اقرب جو سب سے زیادہ نزدیک ہو" و یرجون رحمته"؛ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں"" و یخافون عذابه "اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ "ان عذاب ربک کان محذوراً؛ تیرے پروردگار کا عذاب ایسا ہے جس سے سب ڈرتے ہیں"۔

وہابیوں کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ گمان کرتے ہیں کہ اولیائے الٰہی کے ساتھ توسّل کا مفہوم یہ ہے کہ انہیں (کاشف الضر) سمجھا جائے یعنی انہیں مستقل طور پر مشکلات کا حل کرنے والا سمجھا جائے اور قضائے حاجات اور دفع کربات کا سرچشمہ سمجھا جائے حالانکہ توسّل کا یہ معنی نہیں ہے۔

جن آیات کو وہابیوں نے پیش کیا ہے وہ عبادت کے بارے میں بیان کرتی ہیں۔ حالانکہ کوئی بھی اولیائے الٰہی کی عبادت نہیں کرتا ہے۔

ہم جس وقت پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ توسّل کرتے ہیں کیا انکی عبادت کرتے ہیں؟ کیا ہم پیغمبر اکرمؐ کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ مستقل طور پر مؤثر اور کاشفِ ضر سمجھتے ہیں؟

جس توسّل کی طرف قرآن مجید نے دعوت دی ہے وہ یہ ہے کہ انکو وسیلہ کے ذریعہ خدا

کے نزدیک ہوں، یعنی یہ ذواتِ مقدسہ، بارگاہ خدا میں شفاعت کرتی ہیں۔ وہ چیز جو ہم نے شفاعت کے بارے میں بیان کی ہے۔

در حقیقت توسّل کی واقعیت اور شفاعت کی واقعیت ایک ہی ہے۔ بہت سی آیات شفاعت کو ثابت کرتی ہیں اور دو آیات توسّل کو بیان کرتی ہیں دلچسپ بات یہ ہے کہ سورۃ مائدہ کی ۵۷ نمبر آیت "ایھم اقرب" کے ذریعے توسّل کو بیان کرتی ہے یعنی فرشتے اور حضرت عیسیٰ بھی اپنے لیے وسیلہ منتخب کرتے ہیں وہ وسیلہ جو زیادہ نزدیک ہے "ھم" جمع کی ضمیر ہے جو صاحب عقول کے لیے استعمال کیجاتی ہے۔ یعنی اولیائے الٰہی اور صالحین کے ساتھ توسّل کرتے ہیں، ان صالحین میں سے ہر ایک خدا کے نزدیک تر ہیں۔

بہر حال سب سے پہلے واضح ہونا چاہیے کہ اولیائے الٰہی کے ساتھ توسّل کیا ہے؟

کیا یہ توسّل ان کی عبادت اور پوجا کرنا ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہے۔

کیا انہیں مستقل طور پر مؤثر جاننا ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ کیا انہیں مستقل طور پر قاضی الحاجات اور کاشف الکربات جاننا ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ذواتِ مقدسہ اس شخص کے لیے جس نے انکے ساتھ توسّل کیا ہے خداوند عالم کی بارگاہ میں شفاعت اور سفارش کرتی ہیں۔ اس کی مثال ایسے دی جاسکتی ہے کہ میں کسی بڑی شخصیت کے گھر جانا چاہتا ہوں وہ مجھے نہیں جانتا ہے، میں ایک ایسے شخص کو واسطہ بناتا ہوں کہ جو مجھے بھی جانتا ہے اور اس کے اس شخصیت کے ساتھ بھی تعلقات ہیں۔ اسے کہتا ہوں کے آپ میرے ساتھ چلیں اور اس شخصیت کے ساتھ میرا تعارف کرادیں اور سفارش کردیں۔ یہ کام نہ تو عبادت ہے اور نہ ہی تاثیر میں اسے مستقل سمجھنا ہے۔

یہاں مناسب یہ ہے کہ ہم "ابن علوی" کا کلام نقل کریں جو انہوں نے اپنی مشہور کتاب "مفھوم یجب ان تصحح" میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت سے لوگوں نے توسّل کی حقیقت کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اس لیے ہم (اپنی نظر کے مطابق) توسّل کا صحیح مفہوم پیش کرتے ہیں۔ اور اسے بیان کرنے سے پہلے محترم قاری کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراتے ہیں۔

۱۔ توسّل دعا کا ایک انداز ہے اور حقیقت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف توجہ کرنے کا ایک دروازہ ہے، پس ہدف اور اصلی مقصد اللہ تعالیٰ ہے، اور جس شخصیت کے ساتھ آپ توسّل کررہے ہیں وہ واسطہ اور تقرب بہ خدا کا وسیلہ ہے، اگر کوئی توسّل میں اس کے علاوہ کوئی عقیدہ رکھتا ہو تو وہ مشرک ہے۔

۲۔ جو انسان کسی شخصیت کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری دیتا ہے حقیقت میں یہ انسان کا اسی شخصیت کے ساتھ اظہار محبت ہے اور وہ اس شخصیت کے بارے میں اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقترب ہے اور بالفرض اگر مسئلہ الٹ ثابت ہوجائے تو وہی انسان اس شخصیت سے مکمل طور پر دوری اختیار کرلیتا ہے بلکہ اس کی مخالفت کرنے لگتا ہے۔ تو ہمیں یہاں تک معیار کا علم ہوگیا ہے کہ توسّل کا معیار خداوند کے نزدیک اس شخصیت کا مقترب ہونا ہے۔

۳۔ اگر توسّل کرنے والا انسان اس بات کا عقیدہ رکھتا ہو کہ (متوسّل بہ) جس شخصیت کے ساتھ اس نے توسّل کیا ہے، وہ ذاتی اور مستقل طور پر نفع ونقصان پہنچانے میں اللہ تعالیٰ کی طرح ہے، تو ایسا انسان مشرک ہے۔

۴۔توسّل کوئی واجب یا ضروری چیز نہیں ہے اور نہ ہی یہ دعا قبول ہونے کا منحصر راستہ ہے، اہم چیز دعا ہے اور خداوند کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔جس صورت میں بھی ہو۔جیسا کہ خود خداوند نے ارشاد فرمایا ہے کہ "واذا سالک عبادی عنّی فانّی قریبٌ"(۱)

''ابن علوی مالکی'' اس مقدمہ کو بیان کرنے کے بعد، توسّل کے بارے میں اہلسنت کے علما، فقہاء اور متکلمین کے نظریات بیان کرتا ہے۔اور کہتا ہے کہ اعمال صالحہ کے ذریعے توسّل الی اللہ کی مشروعیت (جواز) کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے یعنی انسان نیک اعمال کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرے، یہ اختلافی مسئلہ نہیں ہے۔مثلاً کوئی روزہ رکھتا ہے، نماز پڑھتا ہے، قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے، صدقہ دیتا ہے اور ان اعمال کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔یہ چیز مسلماً صحیح ہے۔

اس قسم کے توسّل کو حتیٰ کہ سلفیوں نے بھی قبول کیا ہے۔من جملہ" جناب ابن تیمیہ نے اپنی مختلف کتب میں بالخصوص اپنی کتاب" القاعدۃ الجلیلۃ فی التوسّل و الوسیلۃ" میں اس قسم کے توسّل کو قبول کیا ہے۔

ابن تیمیہ نے اس قسم کے توسّل یعنی نیک اعمال کے ذریعے توسّل کے جواز کے بارے میں تصریح کی ہے۔پس اختلاف کہاں ہے؟

کیا اختلاف، اعمال صالحہ کے علاوہ توسّل کے بارے میں ہے؟ مثلاً اولیائے الٰہی کے ساتھ توسّل کیا جائے اور یوں کہا جائے: اللّٰھم انّی اتوسّل الیک بنبیک محمّدٍ؛

۱) سورۂ بقرۃ آیہ ۱۸۶ (ترجمہ) جب میرے بندے مجھ سے سوال کرتے ہیں تو میں قریب ہوں"۔

بارالٰہا میں تیری بارگاہ میں تقرب کے لیے تیرے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو وسیلہ بناتا ہوں۔اس کے بعد ابن علوی اضافہ کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں کہ اس معنیٰ میں اختلاف اور وہابیوں کا اولیائے الٰہی سے توسّل کا انکار کرنا حقیقت میں صرف ظاہری اور لفظی اختلاف ہے، واقعی اور حقیقی اختلاف نہیں ہے۔

بالالفاظ دیگر صرف لفظوں کا نزاع ہے۔کیونکہ اولیائے الٰہی کے ساتھ توسّل حقیقت میں انکے نیک اعمال کے ساتھ توسّل ہے اور یہ ایک جائز امر ہے۔

پس اگر مخالفین بھی انصاف اور بصیرت کی نگاہ سے دیکھیں تو انکے لیے مطلب واضح اور اعتراض ختم ہو جائیگا، اسطرح فتنہ خاموش جائیگا۔اور مسلمانوں پر مشرک اور ضلالت کی تہمت لگانے کی نوبت نہیں آئیگی۔

اس کے بعد موصوف اس مطلب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جو انسان بھی اولیائے الٰہی کے ساتھ توسّل کرتا ہے اس لیے ہے کہ وہ ان سے محبت کرتا ہے۔

اور کیوں اس کے ساتھ محبت کرتا ہے؟ اس لیے کہ اس انسان کا عقیدہ ہے کہ وہ شخص اللہ کا نیک بندہ ہے، یا اس لیئے کہ وہ شخص اللہ کے ساتھ محبت کرتا تھا۔یا اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ محبت کرتا ہے۔یا یہ کہ انسان اس وسیلہ کو پسند کرتا ہے اور اس کے ساتھ محبت کرتا ہے۔جب ہم ان تمام امور میں غور و فکر کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان سب کے باطن میں عمل پوشیدہ ہے یعنی حقیقت میں یہ خدا کی بارگاہ میں نیک اعمال کے ذریعے توسّل ہے۔اور یہ وہی چیز ہے۔جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔(۱)

۱) کتاب مفاہیم یجب ان تصحح ص ۱۱۶، ۱۱۷۔

البتہ ہم بعد میں بیان کریں گے کہ اولیائے الٰہی کے ساتھ توسل اگرچہ انکی شان اور مقام کی خاطر ہو نہ انکے نیک اعمال کی خاطر اس اعتبار سے کہ یہ ذوات مقدسہ خداوند کی بارگاہ میں آبرومند، عزیز اور سربلند ہیں یا کسی بھی خاطر یہ توسل ہو، تو جب تک انہیں تاثیر میں مستقل نہ سمجھیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انہیں شفیع سمجھیں تو ایسا توسل نہ کفر ہے اور نہ خلاف شرع۔

قرآن مجید میں حصۂ و مقامات پر اس قسم کے توسل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے شرک تو تب ہوتا ہے کہ ہم کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں مستقل طور پر مؤثر سمجھیں۔ وہابیوں کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اس آیت " ما نعبدهم الّا ليقرّبونا الى الله زلفى "(۱) میں "عبادت اور "شفاعت" کو آپس میں مخلوط کر دیا ہے۔ اور یہ گمان کیا ہے کہ شفاعت بھی شرک ہے۔ حالانکہ ان واسطوں کی عبادت کرنا شرک ہے نہ انکی شفاعت اور انکے ساتھ توسل کرنا شرک ہے۔ (غور کیجیے)

توسل، اسلامی احادیث کی روشنی میں:

آیات توسل، کے اطلاق کے علاوہ، جو ہر اس توسل کو جو اسلام کے صحیح اعتقادی اصولوں کے خلاف نہ ہو، جائز بلکہ مطلوب قرار دیتی ہیں، ہمارے پاس توسل کے بارے میں بہت سی روایات بھی ہیں جو متواتر یا تواتر کے نزدیک ہیں۔

ان میں سے بہت سی روایات خود پیغمبر اکرمؐ کی ذات کے ساتھ توسل سے مربوط ہیں۔ کہ وہ توسل کبھی آپؐ کی ولادت سے پہلے کبھی ولادت کے بعد، آپ کی حیات میں یا آپؐ کی رحلت کے بعد، کیا گیا ہے۔

---

۱) سورۂ زمر آیت ۳۔

البتہ کچھ روایات پیغمبر اکرمؐ کے علاوہ دیگر دینی شخصیات سے توسل کے ساتھ مربوط ہیں۔

ان میں سے بعض روایات، درخواست اور دعا کی صورت، بعض بارگاہ الٰہی میں شفاعت کے تقاضا کی صورت میں ہیں، بعض میں اللہ تعالیٰ کو پیغمبر اکرمؐ کے مقام کا واسطہ دیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ توسل کی تمام اقسام ان روایات میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اور اس انداز میں ہیں کہ بہانے تلاش کرنے والے تمام وہابیوں پر راستہ بند کر دیتی ہیں۔

اب ان روایات کے چند نمونوں کو ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ پیغمبر اکرمؐ کی ولادت سے پہلے حضرت آدمؑ کا آپؐ سے توسل کرنا

"حاکم" نے "مستدرک" اور دیگر محدثین نے اپنی کتب میں اس حدیث کو نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: کہ جس وقت حضرت آدمؑ سے خطا سرزد ہوئی تو آپؑ نے اللہ سے دعا کرتے ہوئے عرض کیا: " یا ربّ! اسئلک بحقّ محمّد لمّا غفرت لی " پروردگارا میں تجھے حضرت محمدؐ کے حق کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ مجھے بخش دے" اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو نے محمدؐ کو کہاں سے پہچانا حالانکہ ابھی میں نے اسے خلق نہیں کیا ہے؟!

حضرت آدمؑ نے عرض کی: پروردگارا اس معرفت کا سبب یہ ہے کہ جب تو نے مجھے اپنی قدرت سے خلق کیا اور مجھ میں روح پھونکی، میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو یہ جملہ عرش کے پائے پر لکھا ہوا تھا: " لا اله الّا الله محمّد رسول الله " اس عبارت سے میں سمجھ گیا کہ یہ جو محمد کا نام تو نے اپنے نام کے ساتھ لکھا ہے وہ تمام مخلوقات میں سے تیرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم تو نے سچ کہا " انه لاحب الخلق الیّ " وہ

میرے نزدیک تمام مخلوقات سے زیادہ محبوب ہے:

"ادعونی بحقه فقد غفرت لک"(۱)

اس کے حق کا واسطہ دے کر مجھ سے مانگ میں تجھے معاف کر دوں گا"

دوسری حدیث حضرت ابو طالب کے توسّل کے ساتھ مربوط ہے جو انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے بچپن کے زمانے میں آپؐ کے ساتھ کیا۔ حدیث کا خلاصہ یوں ہے کہ جسے "ابن عساکر" نے "فتح الباری" میں نقل کیا ہے:

کہ ایک مرتبہ مکہ میں خشک سالی ہو گئی، تمام قریش جمع ہو کر حضرت ابو طالبؑ کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ سارے کھیت خشک ہو چکے ہیں، قحط نے ہر جگہ تباہی مچا رکھی ہے۔ آؤ خداوند کے حضور چلیں اور بارش کے لیے دعا کریں۔

حضرت ابو طالبؑ ساتھ چلے اور انکے ساتھ ایک بچہ بھی تھا (بچے سے مراد پیغمبر اکرمؐ ہیں جو ابھی طفولیت کا زمانہ گزار رہے تھے) اس بچے کا چہرہ آفتاب کی طرح درخشاں تھا۔ جناب ابو طالبؑ نے اس بچے کو گود میں لیا ہوا تھا۔ اسی حالت میں اپنی کمر کو خانہ کعبہ کی دیوار کے ساتھ لگایا اور اس بچے سے توسّل کیا، اسی وقت آسمان پر بادل اُمڈ آئے اور ایسی بارش برسی کہ جس کے نتیجے میں خشک بیابان سرسبز ہو گئے۔ اس وقت جناب ابو طالبؑ نے پیغمبرؐ کی شان میں ایک شعر کہا جو یوں ہے۔

---

۱) حاکم نے مستدرک، جلد ۲ ص ۶۱۵ پر اور حافظ سیوطی نے "الخصائص النبویۃ" میں اسے نقل کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے اور بیہقی نے اسے "دلائل النبوۃ" میں نقل کیا ہے کہ عام طور پر اس کتاب میں وہ ضعیف روایت نقل نہیں کرتے ہیں اور قسطلانی اور زرقانی نے مواہب اللدنیہ میں اس حدیث کو نقل کیا اور صحیح قرار دیا ہے اور دیگر علماء نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ مزید توضیح کے لیے کتاب "مفاہیم یجب ان تصحح ص ۱۲۱ اور اسکے بعد رجوع فرمائیں"۔

"و ابیض یستسقی الغمام بوجهه
ثمال الیتامی عصمة للارامل"(۱)

کہ پیغمبر اکرمؐ کے نورانی چہرے کے صدقے یہ بادل برس رہے ہیں۔ یہ بچہ یتیموں کا ملجا اور بیوہ عورتوں کی پناہ گاہ بنے گا"

ایک نابینا مرد نے پیغمبر اکرمؐ کی ذات سے توسّل کیا۔ وہ آپؐ کی نبوت کے زمانے میں آپکی خدمت میں پہنچا، توسّل کر کے شفا پائی اور اسکی آنکھیں واپس لوٹ آئیں

یہ روایت صحیح ترمذی، اسی طرح سنن ابن ماجہ، مسند احمد اور دیگر کتب میں نقل ہوئی ہے (۱) اس سے پتہ چلتا ہے کہ سند کے اعتبار سے حدیث محکم ہے۔ بہر حال حدیث یوں ہے۔

"کہ ایک نابینا آدمی آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کرنے لگا:

اے رسولؐ خدا! اللہ تعالیٰ سے دُعا کیجئے کہ وہ مجھے شفا دے اور میری آنکھوں کی بینائی مجھے لوٹا دے۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: اگر تو کہتا ہے تو میں تیرے لیے دعا کرنے کو تیار ہوں اور اگر صبر کرتا ہے تو یہ صبر تیرے لیئے بہتر ہے (اور شاید تیری مصلحت اسی حالت میں ہو) لیکن اس بوڑھے آدمی نے اپنی حاجت پر اصرار کیا۔ تو اس پر پیغمبر اکرمؐ نے اس بوڑھے آدمی کو حکم دیا کہ مکمل اور اچھے انداز میں وضو کرو اور دو رکعت نماز پڑھو، نماز کے بعد یہ دعا پڑھو:

"اللهم انی اسئلک و أتوجه الیک بنبیک محمدٍ
نبی الرحمة یا محمدُ انی اتوجه بک الیٰ

---

۱) فتح الباری، جلد ۲ ص ۳۹۴ و اسی طرح سیرۂ حلبی، جلد ۱ ص ۱۱۶۔

ربّی فی حاجتی لتقضیٰ، اللّھم شفعه، فیّ"(۱)

بارالہا میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف توجہ کرتا ہوں تیرے نبی محمد مصطفیؐ کے واسطے کہ جو نبی رحمت ہیں۔ اے محمدؐ میں آپؐ کے وسیلہ سے اپنے پروردگار کی طرف اپنی حاجت طلب کرنے چلا ہوں تا کہ میری حاجت پوری ہو جائے اور اے اللہ انہیں میرا شفیع قرار دے۔

وہ نابینا آدمی چلا تا کہ وضو کرے، نماز پڑھے اور پیغمبر اکرمؐ کی تعلیم دی ہوئی دعا پڑھے۔ اس حدیث کا راوی عثمان بن عمیر کہتا ہے کہ ہم بہت سے افراد اسی محفل میں بیٹھے ہوئے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہی بوڑھا آدمی مجلس میں داخل ہوا اس حال میں کہ اس کی آنکھیں بینا ہو چکی تھیں اور نابینائی کا کوئی اثر اس پر باقی نہیں تھا۔

دلچسپ یہ ہے کہ بہت سے اہلسنت کے اکابر نے صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ ترمذی نے اس حدیث کو صحیح جانا ہے۔ ابن ماجہ نے بھی کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ رفاعی نے بھی کہا ہے کہ بلاشک وشبہ یہ حدیث صحیح اور مشہور ہے۔(۲)

پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد اُن سے توسل"

اہلسنت کے معروف عالم دین "دارمی" نے اپنی مشہور کتاب "سنن دارمی" میں ایک

---

۱) صحیح ترمذی، ص ۱۱۹، حدیث ۳۵۷۸، اور سنن ابن ماجہ، جلد ۱، ص ۴۴۱، حدیث ۱۳۸۵، و مسند احمد، جلد ۴، ص ۱۳۸۔

۲) مزید وضاحت کے لیے آپ کتاب مجموعۃ الرسائل والمسائل، جلد ۱، ص ۱۸ طبع بیروت، کیطرف رجوع فرمائیں۔ ابن تیمیہ کی یہی عبارت یہ ہے "ان النسائی و الترمذی رویا حدیثاً صحیحاً ان النبی علّم رجلاً ان یدعو فیسال اللہ ثم یخاطب النبی فیوسّل به ثم یسال اللہ قبول شفاعته"

باب اس عنوان سے قرار دیا ہے کہ "باب ما اکرم اللہ تعالیٰ نبیہ بعد موته" (یہ باب اس کرامت اور احترام کے بارے میں ہے جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبرؐ کے ساتھ مختص کیا ہے ان کی رحلت کے بعد) اس باب میں وہ یوں رقمطراز ہیں۔

"ایک مرتبہ مدینہ میں شدید قحط پڑ گیا۔ بعض لوگ حضرت عائشہ کی خدمت میں گئے اور ان سے چارہ جوئی کے لیے کہا۔ حضرت عائشہ نے فرمایا جاؤ پیغمبر اکرمؐ کی قبر پر چلے جاؤ۔ اور قبر والے کمرے کی چھت میں سوراخ کرو، اس انداز میں کہ آسمان اندر سے نظر آئے اور پھر نتیجہ کی انتظار کرو۔ لوگ گئے انہوں نے اسی انداز میں سوراخ کیا کہ آسمان وہاں سے نظر آتا تھا؛ بارش برسنا شروع ہو گئی اسقدر بارش برسی کہ کچھ ہی عرصہ میں بیابان سرسبز ہو گئے اور اونٹ فربہ ہو گئے۔(۱)

"پیغمبر اکرمؐ کے چچا حضرت عباسؓ سے توسل":

امام بخاری نے صحیح بخاری میں نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ میں قحط تھا تو حضرت عمر ابن خطاب نے اللہ تعالیٰ کو حضرت عباس بن عبدالمطلب کا واسطہ دیتے ہوئے باران رحمت طلب کی انکی دعا کی عبارت یہ تھی "اللّھم انا کنا نتوسّل الیک بنبینا و تسقینا و انا نتوسّل الیک بعمّ نبینا فاسقنا" بارالہا ہم اپنے پیغمبرؐ کے ساتھ توسل کرتے تھے تو تو ہم پر باران رحمت نازل فرماتا تھا۔ آج ہم تجھے اپنے نبیؐ کے چچا کا واسطہ دے کر دعا کرتے ہیں کہ ہم پر باران رحمت نازل فرما"

راوی کہتا ہے، اس دعا کے بعد فراوان بارش نازل ہوئی (۲)

---

۱) سنن دارمی، جلد ۱، ص ۴۳۔

۲) صحیح بخاری، جلد ۲، ص ۱۶، باب صلاۃ الاستسقاء۔

۶۔ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ میں امام شافعی سے نقل کیا ہے کہ امام شافعی ہمیشہ اہلبیت رسولؐ کے ساتھ توسّل کرتے تھے انہوں نے یہ مشہور شعر، ان سے نقل کیا ہے:

آل النبی ذریعتی — و هم الیه وسیلتی
أرجوا بهم أعطی غداً — بید الیمین صحیفتی

رسولخداؐ کا خاندان میرا وسیلہ ہیں، خداوند کی بارگاہ میں وہی میرے تقرب کا ذریعہ ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ کل قیامت کے دن انکی برکت سے میرا نامہ اعمال میرے دائیں ہاتھ میں تھمایا جائے!

اس حدیث کو "رفاعی" نے اپنی کتاب "**کتاب التوصل الیٰ حقیقة التوسّل**" میں بیان کیا ہے(۱)

اسی مصنف نے کہ جو توسّل کے بارے میں بہت سخت عقیدہ رکھتا ہے۔ اہلسنت کے مختلف منابع سے ۲۶ احادیث توسّل کے بارے میں نقل کی ہیں اگر چہ اس کی کوشش یہی رہی ہے کہ بعض احادیث کے بارے میں خدشہ ظاہر کرے لیکن احادیث تواتر کی حد تک یا تواتر کے قریب ہیں اور اہلسنت کی مشہور کتب میں نقل کی گئی ہیں۔ لہٰذا ان احادیث پر اتنی جلدی اعتراض نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور ہم نے تو یہاں پر اس باب سے صرف چند احادیث کا تذکرہ کیا ہے ورنہ اس بارے میں احادیث بہت زیادہ ہیں۔

---

۱) التوصل الی حقیقة التوسّل، ص ۳۲۹۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔وہابیوں کے بہانے:

متعصب وہابی اپنے ہدف کو ثابت کرنے کیلئے، یعنی ان مسلمانوں پر فسق اور کفر کی تہمت لگانے کے لیے کہ جو اولیاء کے ساتھ توسّل کرتے ہیں، مندرجہ بالا آیات اور روایات کے مقابلے میں کہ جو مختلف شکلوں میں توسّل کو جائز قرار دیتی ہیں بہانے بناتے ہیں اور یہ بہانہ جوئی ایسے ہی ہے جیسے بچے بہانے بناتے ہیں!

کبھی یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان صالحین اور بزرگان کی ذات سے توسّل کرنا حرام ہے، ان کے مقام کے ساتھ توسّل کرنا حرام نہیں ہے۔ اسی طرح انکی دعا اور شفاعت میں بھی کوئی حرج نہیں ہے صرف انکی ذات کے ساتھ توسّل کرنا حرام ہے۔

کبھی کہتے ہیں کہ انکی زندگی میں توسّل کرنا تو جائز ہے لیکن وفات کے بعد توسّل کرنا جائز نہیں ہے۔ چونکہ جب وہ اس دنیا سے منتقل ہو جاتے ہیں تو ان کا ہمارے ساتھ رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے "**انک لا تسمع الموتی**" اے پیغمبر آپ مُردوں تک اپنی آواز نہیں پہنچا سکتے ہیں"(۱) یعنی آپ کا رابطہ انکے ساتھ منقطع ہو چکا ہے۔

لیکن اس قسم کی بہانہ تراشیاں واقعاً شرمناک ہیں کیونکہ:

اوّلاً: قرآن مجید نے ایک عام حکم بیان کیا ہے، ہم اس آیت کے عموم یا اطلاق کے ساتھ تمسک کرتے ہوئے توسّل کی ان تمام اقسام کو جائز سمجھتے ہیں جو "توحید عبادی" اور "توحید افعالی" کے ساتھ منافی نہ ہوں۔

---

۱) سورۂ نمل آیہ ۸۰۔

قرآن مجید میں ہے" وابتغوا الیه الوسیله" جیسا کہ بیان کیا ہے وسیلہ اس چیز کو کہتے ہیں جو خدا کے تقرب کا ذریعہ بنے۔ پس جو شے بھی آپ کو خدا کے قریب کرنے کا وسیلہ بن سکتی ہے آپ اسے انتخاب کر سکتے ہیں۔ چاہے وہ پیغمبرؐ کی دعا ہو یا شفاعت، مقام پیغمبرؐ ہو یا ذات پیغمبرؐ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی، اطاعت، عبودیت اور دیگر صفات حسنہ کی وجہ سے اس کی بارگاہ میں محبوب و مقرب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے کہ ان امور کے ذریعے بارگاہ خدا میں تقرب حاصل کرو۔ پس وسیلہ کو صرف انسان کے اپنے نیک اعمال میں منحصر کرنے پر کوئی دلیل نہیں ہے جس کا وہابی دعویٰ کرتے ہیں۔

وسیلہ کی جو اقسام ہم نے بیان کی ہیں نہ تو یہ توحید در عبادت میں رخنہ پیدا کرتی ہیں کیونکہ ہم صرف خدا کی عبادت کرتے ہیں نہ پیغمبر اکرمؐ کی اور نہ ہی توحید افعالی میں خدشہ ایجاد کرتی ہیں، کیونکہ صرف اللہ تعالیٰ نفع و نقصان کا مالک ہے، اس کے علاوہ جس کسی کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہے اور اسی کے واسطہ سے ہے۔

آیات میں اس قسم کے عموم کے بعد اب کس چیز کا انتظار ہے؟

یہ بہانہ تراشی تو ایسے ہے جیسے قرآن مجید فرماتا ہے" فاقرء وا ما تیسر من القرآن" جتنا قرآن مجید کی تلاوت کر سکتے ہو کرو" (۱) اب اگر کوئی بہانہ بنائے اور شک کرے کہ کھڑے ہو کر قرآن مجید کی تلاوت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ لیٹ کر تلاوت کرنا کیسے ہے؟ آیت کا عموم کہہ رہا ہے تلاوت قرآن کی تمام اقسام جائز ہیں۔ تلاوت سفر میں ہو یا حضر میں۔ وضو کے ساتھ ہو یا بغیر وضو کے اس وقت تک جائز ہے جب تک کوئی دلیل اس عموم کے خلاف قائم نہ ہو جائے۔

قرآن مجید کے عمومات اور اطلاقات اس وقت تک قابل عمل ہیں، جب تک کوئی مانع اور رکاوٹ درپیش نہ آئے۔ توسل والی آیات بھی عام ہیں اور آیات قرآن کے عموم پر عمل کیا جا سکتا ہے جب تک کوئی مانع نہ ہو۔ پس ہم بھی ان عمومات پر عمل کریں گے اور یہ بہانے تراشیاں قبول نہیں کریں گے۔

ثانیاً: توسل کے مسئلہ میں بیان ہونے والی روایات کہ جن میں سے بعض کو ہم نے اوپر پیش کیا ہے اس قدر متنوع ہیں کہ توسل کی تمام اقسام کی اجازت دیتی ہیں۔ خود پیغمبر اکرمؐ کی ذات کے ساتھ توسل جیسے نابینا والے واقعہ میں بیان ہوا۔ پیغمبر اکرمؐ کی قبر مبارک کے ساتھ توسل جیسا کہ بعض واقعات میں بیان ہوا۔ اسی طرح پیغمبر کی دعا سے توسل، انکی شفاعت سے توسل جیسا کہ دیگر واقعات میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان متنوع اور مختلف روایات کی روشنی میں بہانہ تراشیوں کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔

ثالثاً: پیغمبر اکرمؐ کی ذات سے توسل سے کیا مراد ہے؟ ہماری نظر میں کیوں پیغمبر اکرمؐ کی ذات کا احترام ہے اور ہم انہیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شفیع بناتے ہیں؟ یہ اس لیے کہ پیغمبر اکرمؐ اطاعت اور عبودیت کی اعلیٰ ترین منزل پر فائز تھے۔ پس حقیقت میں پیغمبر کی ذات کے ساتھ توسل انکی اطاعات، عبادات اور افعال حسنہ کے ساتھ توسل ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے متعصب وہابی بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی قائل ہیں کہ طاعات کے ساتھ توسل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

پس صرف الفاظ کا جھگڑا ہے۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ بعض وہابی پیغمبر اکرمؐ کی برزخی زندگی کا انکار کرتے ہیں اور انکی وفات کو (معاذ اللہ) کفار کی وفات جیسا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید شہداء کے لیے حیات

جاوید کا تذکرہ کرتا ہے "بل احیاء عند ربھم یرزقون" (۱)

کیا پیغمبر اکرم کا مقام شہداء کے مقام سے کم ہے، جبکہ آپ سب لوگ اپنی نمازوں میں ان پر درود بھیجتے ہیں۔ اگر رسولخدا وفات کے بعد توسل کرنے والوں کے توسل کو نہیں سنتے تو پھر آپ کا سلام بھیجنا بے فائدہ ہے (خدا سے پناہ مانگتے ہیں اس اندھے تعصب سے کہ جو انسان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتا ہے)۔

البتہ ان میں سے بعض علماء آنحضرت کی حیات برزخی کے قائل ہیں انہیں اپنے اس نظریہ کے مطابق اپنا اعتراض واپس لے لینا چاہیے۔

۲۔ "افراطی اور غالی افراد"

ہم افراط اور تفریط کرنے والے دونوں گروہوں کے درمیان میں ہیں ایک طرف وہ لوگ ہیں جو توسل کے مسئلہ میں معترض ہیں اور اعتراض تراشی کرتے ہیں اور جس توسل کی قرآن و حدیث نے اجازت دی ہے وہ اسے جائز نہیں سمجھتے ہیں۔ اور گمان کرتے ہیں کہ ان کا یہ نظریہ انکی توحید کے کمال کا باعث ہے حالانکہ وہ سراسر غلطی پر ہیں۔ کیونکہ اولیائے الہی کے ساتھ! انکی اطاعت، عبادت، اعمال اور بارگاہ الہی میں انکے تقرب کیوجہ سے توسل کرنا، مسئلہ توحید پر تاکید ہے اور ہر شے کا خدا سے طلب کرنا ہے۔

دوسری طرف ایک افراطی گروہ ہے جو توسل کی آڑ میں غلو کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ان غالیوں کا خطرہ اور نقصان اس پہلے گروہ سے کم نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ بعض اوقات ایسے جملے استعمال کرتے ہیں جو توحید افعالی کے ساتھ ساز گار نہیں ہیں۔ یا بعض اوقات ایسی باتیں

---

۱) سورۃ آل عمران آیت ۱۶۹۔

کرتے ہیں جو عبادت میں توحید کے ساتھ منافی ہیں۔ چونکہ "لامؤثر فی الوجود الا اللّٰہ" اس عالم وجود میں مؤثر واقعی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور جو کچھ بھی موجود ہے اس کی بدولت ہے۔

لہذا جس طرح ہمیں صحیح توسل کے منکر افراد کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے یا انہیں ارشاد کرنا چاہیے اور غلطیوں سے روکنا چاہیے، اسی طرح افراطی گروہ اور غالیوں کو بھی ارشاد کرنا چاہیے اور انہیں راہ راست کی طرف لوٹانا چاہیے۔

درواقع یہ کہا جاسکتا ہے کہ توسل کے منکرین کی پیدائش کا ایک سبب توسل کے قائل افراد میں سے بعض کا افراط اور غلو ہے جب انہوں نے افراط سے کام لینا شروع کیا تو فطرتی سی بات تھی کہ تفریطی ٹولہ انکے مقابلے میں ایجاد ہو جائیگا۔ یہ ایک ایسا قانون ہے جو تمام اعتقادی، اجتماعی اور سیاسی مسائل میں پایا جاتا ہے اور انحرافی گروہ ہمیشہ ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہوتے ہیں اور دونوں گروہ غلط راستے پر ہٹ دھرمی کے ساتھ گامزن رہتے ہیں۔

۳: تنہا توسل کافی نہیں ہے۔

لوگوں کو اس بات کی تلقین کرنی چاہیے کہ صرف اولیائے الہی اور صالحین کے ساتھ توسل پر اکتفا نہ کریں۔ کیونکہ توسل تو ہمارے لیئے ایک درس ہے۔ وہ اسطرح کہ ذہن میں سوال اٹھتا ہے، کہ ہم ان اولیاء کے ساتھ کیوں توسل کرتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ اس لیے توسل کرتے ہیں کیونکہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آبرومند ہیں، کیوں آبرومند ہیں؟! اچھے نیک اعمال کی وجہ سے آبرومند ہیں پس ہمیں بھی نیک اعمال کی طرف جانا چاہیے۔ یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ توسل ہمیں درس دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب نیک اعمال کے ذریعے

حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اور اولیائے الٰہی کے ساتھ توسّل بھی انکے نیک اعمال کیوجہ سے ہی کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے اعمال صالح کیوجہ سے خدا کا قرب حاصل کرچکے ہیں اور ہم توسّل میں ان سے تقاضا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری بھی شفاعت کریں، لہٰذا ہمیں بھی کوشش کرنی چاہیے کہ جس راستے کو انہوں نے طے کیا ہے ہم بھی اس راستے پر عمل پیرا ہوں۔ توسّل کو ایک انسان ساز اور تربیت کرنے والے مکتب میں تبدیل ہونا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم توسّل پر ہی رک جائیں اور اس کے بلند مقاصد کو فراموش کردیں۔ یہ ایک اہم بات تھی جس کی طرف ہم سب کو متوجہ رہنا چاہیے۔

۴: امور تکوینی میں توسّل:

ایک اور نکتہ جس کی طرف توجہ ضروری ہے، یہ ہے کہ عالم اسباب کے ساتھ توسّل جسطرح امور تشریعی میں موجود ہے اسی طرح امور تکوینی میں بھی موجود ہے اور ان میں سے کوئی سا توسّل بھی توحید کی راہ میں مانع نہیں ہے۔ ہم جس وقت اپنے مطلوبہ نتائج تک پہنچنا چاہتے ہیں تو اپنی عادی زندگی میں اسباب کے پیچھے جاتے ہیں، زمین میں ہل چلاتے ہیں، بیج بوتے ہیں آبیاری کرتے ہیں۔ فصل کی حفاظت کرتے ہیں، اور پھر موقع پر فصل کاٹتے ہیں اور اس سے اپنی زندگی میں استفادہ کرتے ہیں کیا یہ اسباب کے ساتھ توسّل کرنا ہمیں اللہ تعالیٰ سے غافل کردیتا ہے؟ کیا اس بات کا عقیدہ رکھنا کہ زمین سبزہ اگاتی ہے۔ اور سورج کا نور اور بارش کے حیات بخش قطرے بیج، گل و گیاہ اور پھلوں کی پرورش میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ یا کلی طور پر عالم اسباب کے وسیلہ ہونے کے بارے میں عقیدہ رکھنا کیا توحید افعالی کے منافی

ہے؟ یقیناً منافی نہیں ہے۔ کیونکہ ہم عالم اسباب میں صرف اسباب مہیا کرتے ہیں اور مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ کی ذات کو جانتے ہیں۔

پس جس طرح طبیعی اسباب کے ساتھ توسّل کرنا توحید کے ساتھ منافی نہیں ہے سی طرح عالم تشریع میں انبیاء، اولیاء اور معصومینؑ کے ساتھ توسّل کرنا اور ان سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شفاعت کا تقاضا کرنا بھی توحید کے ساتھ منافی نہیں ہے۔

البتہ اس عالم تکوین کے بارے میں بھی ایک افراطی گروہ موجود ہے جو اصلاً عالم اسباب کا انکار کرتے ہیں۔ وہ گمان کرتے ہیں کہ عالم اسباب پر عقیدہ رکھنا توحید افعالی کے ساتھ منافی ہے۔ اسی لیے وہ قائل ہیں کہ آگ نہیں جلاتی ہے بلکہ جس وقت آگ کسی شے کے نزدیک ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس شے کو جلاتا ہے، اسی طرح پانی آگ کو نہیں بجھاتا ہے بلکہ جس وقت آگ پر پانی ڈالا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس آگ کو بجھا دیتا ہے۔ یہ لوگ اس انداز میں علت اور معلول کے درمیان پائے جانے والے تمام واضح اور بدیہی روابط کا انکار کرتے ہیں۔

حالانکہ قرآن مجید واضح انداز میں عالم اسباب کو قبول کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ ہم بادلوں کو بھیجتے ہیں اور یہ بادل تشنہ زمینوں کو سیراب کرتے ہیں اور انکے ذریعے مردہ زمینیں زندہ ہوجاتی ہیں " فیحیی به الارض بعد موتها " (۱)

"یُحیی به" یعنی یہ بارش کے قطرے زمین کو حیات بخشتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی آیات عالم اسباب کے وسیلہ ہونے کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں لیکن بہرحال یہ اسباب ذاتی طور پر کوئی قدرت نہیں رکھتے ہیں بلکہ جو کچھ بھی ان کے پاس ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہے۔ یہ آثار اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں۔ جس طرح اسباب طبیعی کے منکر،

۱) سورۂ روم آیہ ۲۴۔

غافل خطا کار ہیں اسی طرح عالم تشریع میں بھی اسباب کا انکار کرنے والے غلطی پر ہیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ گذشتہ سطور کی روشنی میں یہ لوگ تعصب سے ہاتھ کھینچ لیں اور صحیح راستہ کا انتخاب کرلیں اور اسطرح بے جا تکفیر اور تفسیق کا خاتمہ ہو جائے اور پوری دنیا کے مسلمان آپس میں اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان دشمنوں کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ جائیں جنہوں نے قرآن، اسلام اور خدا کو اپنے حملوں کا نشانہ بنایا ہوا ہے۔ اور اسطرح اسلامی تعلیمات کو ہر قسم کے شرک، غلو و زیادتی اور کوتاہی و نقصان سے پاک کر کے پوری دنیا کے سامنے پیش کریں۔

والسلام

شعبان ۱۴۲۶ ھ ق

ناصر مکارم شیرازی

یا صاحب الزمانؑ ادرکنی

خدمتگارانِ مکتبِ اهلبیت (ع)

سید حسن علی نقوی

حسّان ضیاء خان

سعد شمیم

حافظ محمد علی جعفری

التماس سورۃ الفاتحہ

سیدہ فاطمہ رضوی بنت سید حسن رضوی

سید ابوزر شہرت بلگرامی ابن سید رضوی

سید مظاہر حسین نقوی ابن سید محمد نقوی

سید محمد نقوی ابن سید ظہیر الحسن نقوی

سید الطاف حسین ابن سید محمد علی نقوی

سیدہ امّ حبیبہ بیگم

حاجی شیخ علیم الدین

شمشاد علی شیخ

مسیح الدین خان

فاطمہ خاتون

شمس الدین خان